(جملہ حقوق محفوظ)

متاعِ اقبالؒ

یعنے

(علامہ اقبالؒ کی شاعری کے مختلف
پہلوؤں پر ایک اجمالی بحث)

(انر)

ابو ظفر عبد الواحد، ام اے۔
لکچرار، سٹی کالج
حیدر آباد دکن

مطبوعہ
مکتبۂ ابراہیمیہ پریس۔ حیدر آباد دکن
قیمت (عہ)

مُندرجات

دیباچہ ۱ - ج

عَلّامہ اقبال کی تصویر

(۱) اقبال کی شاعری اور اُس کا پس منظر (۱ تا ۱۶)

(۲) اقبال کا ذہنی ارتقا (۱۷ تا ۸۰)

(۳) اقبال کا شاعرانہ فَلسفہ (۸۱ تا ۱۰۰)

دیباچہ

اقبال کی ہمہ گیر شخصیت دیباچوں کی محتاج نہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ اُس پر ضخیم کتابیں لکھی جائیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ "دیباچہ" ہی معلوم ہوں گی۔ میرا یہ دیباچہ اس معنی میں دیباچہ نہیں بلکہ عرضِ مُدعا کا ایک بہانہ ہے جسکے ذریعے میں اپنا پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

کوئی بیس۲۰ سال سے مجھے اقبال کی شاعری سے شغف کیا، عشق رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں اُن کی شاعری کے مختلف رُجحانات پر غور کرنے اور اُن کے کلام کو بارہا پڑھنے اور پڑھانے کا مجھے موقع ملا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مضامین اور تبصرے بھی نظر سے گذرتے رہے جن میں بعض اچھے بھی دیکھنے میں آئے۔ لیکن ایک مضمون بھی (جہاں

تک مجھے علم ہے) ایسا نظر سے نہیں گذرا جس میں اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کے ہر جہتی پہلو کو سامنے رکھ کر، ایک مکمل تصویر پیش کی جاتی۔ میں نے غالباً پہلی بار اس امر کی کوشش کی ہے کہ اقبال کو بہ حیثیت ایک "کل" کے پیش کروں۔ البتہ ایک غلطی مجھ سے بھی ہوی ہے۔ وہ یہ کہ فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے ایک اقبال کے دو اقبال میں نے بھی کر دیئے ہیں۔ لیکن یہاں میں بھی مجبور تھا اور وہ بھی۔ وہ خود بعض اوقات ایک برگزیدہ شاعر اور بعض اوقات بڑے فلسفی نظر آتے ہیں۔

غرضکہ فلسفہ اور شعر، اقبال کے شاعرانہ کمال کے اہم عناصر ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہی "متاعِ اقبال" ہے جسے کتابی شکل میں اپنے "تاثرات کے ساتھ الگ ابواب میں پیش کر رہا ہوں۔ اصل میں یہ ابواب میری عدیم الفرصتی کے دو خاکے ہیں جو دو الگ قسطوں میں سب رس اور اُردو کے "اقبال نمبر" میں کچھ دنوں پہلے چھپے تھے۔ سب رس والے مضمون میں (جو بڑی عجلت اور بے اطمینانی کے عالم میں لکھا گیا تھا) خاص طور پر آخری حصّے میں بہت کچھ ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ البتہ دوسرے مضمون میں (جو اُردو میں چھپا تھا) کسی قسم کی کاٹ چھانٹ نہیں ہوئی۔

تیسرا خاکہ حیدر آباد کے محکمۂ نشر کی فرمائش کی بنا پر میں نے تیار کرنا شروع کیا تھا۔ اس تیسرے مضمون کا عنوان ہے۔ "اقبال کی

شاعری اور اُس کا پس منظر" جس میں ملک اور بیرون ملک کے عام سیاسی اور تاریخی حالات کے ساتھ اقبال کی شاعری کے اہم خط و خال روشن کئے گئے ہیں۔

کتابی شکل میں تینوں مضامین مقدم و موخر کر دئے گئے ہیں۔ یہ ترتیب (جیسا کہ پڑھنے والے پڑھنے کے بعد خود محسوس کریں گے) نیچرل بھی ہے۔

اقبال کی ایک نایاب تصویر جو خود اُن کے اشعار کی روشنی میں عنوان کتاب کے معنوی پہلو کو روشن کرتی ہے، شامل اوراق کی گئی ہے۔ اس کا "بلاک" میری درخواست پر میرے دوست ڈاکٹر زور نے (جنکی نگرانیٔ خاص میں سب رس شائع ہوتا ہے) مجھے بہ طیب خاطر عنایت فرمایا، جس کا تشکر آمیز اظہار مجھ پر لازم ہے۔

سٹی کالج حیدرآباد دکن
جون ۱۹۳۹ء

ابو ظفر عبد الواحد

لیکن چونکہ مضمون زیر بحث کتابی شکل میں لانا ضروری تھا اور مجھ سے غیر مطبوعہ تقریر کے نشر کی فرمائش کی گئی تھی، اس لیئے میں نے ایک دوسرا مضمون اسی موضوع پر پڑھا۔

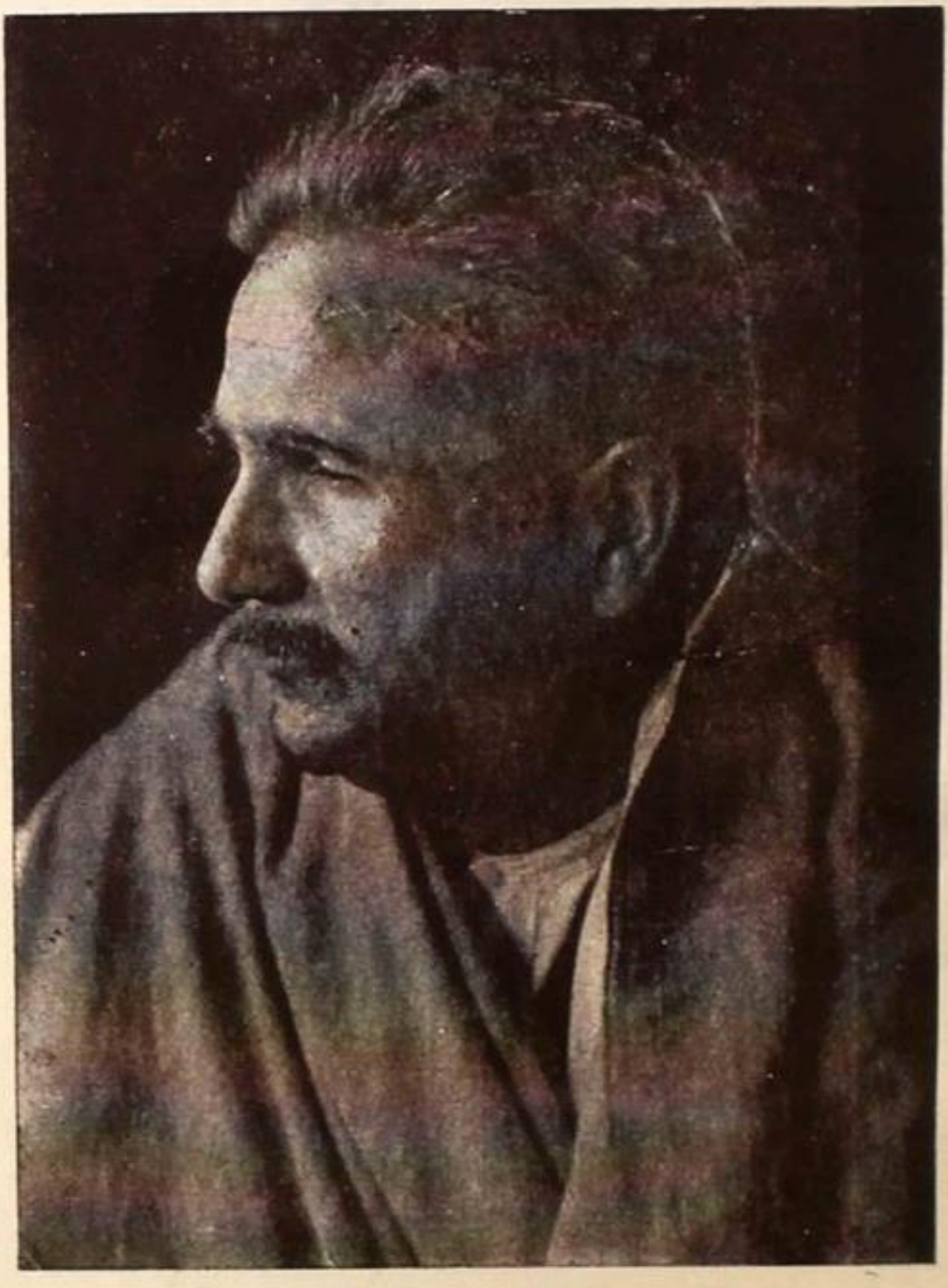

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے کارواں میں لٹا دے اسے لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

(بال جبریل)

(۱)

اقبال کی شاعری اور اس کا پس منظر

(مرقومۂ ستمبر ۱۹۳۸ء)

اُردو شاعری کے بارے میں دو غلط فہمیاں عام ہیں۔ ایک یہ کہ اردو شاعری، فارسی شاعری، کی نقل ہے۔ دوسری یہ کہ اُس کا لہجہ بناوٹی اور اُس کا دائرہ عمل محدود ہے۔ دونوں مفروضے سطحی حمایت پر قائم ہیں۔ ہے یہ کہ جن حالات میں فارسی شاعری نے ایران میں جنم لیا، وہی حالات ہندستان میں بھی موجود تھے۔ چنگیز اور ہلاکو خاں کی تُرکانہ یورش سے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجگئی۔ خلافت بغداد اور اُس کی مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ایران نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی شخصی حکومت الگ قائم کی اور قدیم پہلوی زبان کے احیاء اور قدیم ایرانی روایات کو از سرِ نو تازہ کرنے کا خیال اُس کے فرمانرواؤں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اس طرح پہلوی اور عربی زبان کے میل سے ایک نئی زبان پیدا ہوی جس نے فارسی نام پایا۔ لیکن تاتاری قوم کی

یورشں اور غارتگری نے ایران کو دم لینے نہ دیا۔ انتشار، اور بدنظمی نے ایرانیوں کے ہوش وحواس مختل کر دئے تھے۔ تباہ کاری اور بربادی کا نقشہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان حالات میں زندگی کی آزاد راہیں بند ہو گئیں اور شعرا کے سامنے بے ثباتی اور ایک محدود قسم کی زندگی یعنی عشق و عاشقی کے سوا اور کوئی تصور، زندگی کا باقی نہ رہا۔ اور چونکہ ترکوں کی تباہ کاریوں اور لوٹ مار کا سماں نظروں کے سامنے تھا ہی، اس لئے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی اور معشوق کی بیداد گری کی داستان بیان کرنے میں وہی مال مسالا استعمال ہونے لگا۔ معشوق کیا ہی اچھا خاصہ چنگیز یا ہلاکو ہے جو شمشیر و سنان اور تیر و تفنگ کے بغیر بات نہیں کرتا۔ بات، بات پر ترکمانی وار کرتا ہے اور عاشق کی مسکینی اور وفاشعاری کو خاطر میں نہیں لاتا۔

تقریباً یہی حالات سلطنتِ بہمنیہ کی درہمی کے وقت دکن میں موجود تھے جبکہ دکھنی زبان میں اُردو ادب کا بیرنگ تیار ہونا شروع ہوا۔ ایک مرکزی حکومت ٹوٹ کر چار چھوٹی، چھوٹی ریاستیں گولکنڈہ بیجاپور، احمد نگر، اور بیدر میں قائم ہوئیں اور ہر ایک کے فرمانرواؤں نے اپنی فیاضی اور ادب نوازی سے شعرا اور اہل قلم کو نوازا۔ فارسی کی

طرح اردو شاعری اور ادب کے محدود ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو اپنے آزاد رجحان کے خلاف اپنے مربیوں کی مرضی اور میلان کا بھی خیال کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ دکن کی ان اولین ادبی کوششوں میں دکن کے ان والیوں کی اُفتادِ طبیعت اور مذہبی معتقدات کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ دکھنی شعرا کی شاعری کے موضوع زیادہ تر مذہبی ہیں۔ اسلئے کہ شعرا کے فرمانروا مربی مذہبیت، اور اُن میں سے بعضے شیعیت کی طرف مائل تھے۔ لہذا مرثیہ گوئی نے زیادہ فروغ پایا، یا پھر اُس محدود قسم کی شاعری نے جس کا انحصار عشق و عاشقی یا اپنے اُن داتا محبوب یا مالک پر ہے جس کی فیاضی پر شعرا کی معاش اور شہرت کا مدار تھا۔

اورنگ زیب کے ہاتھوں گولکنڈے کی تباہی اور گولکنڈے کے آخری تاجدار کی نظر بندی کے بعد، تقریباً تمام جنوب پر مغلوں کا پرچم لہرایا۔ اور شمال و جنوب ایک مرکزی حکومت کے جھنڈے تلے آئے۔ اگر اورنگ زیب کے جانشین اُس کے جمے جمائے راج کو بیدار مغزی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ ہندستان میں ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ساتھ ایک متحد ذہنیت اور ایک عظیم اور

متحدہ "کلچر" پیدا ہو جاتا جس کی داغ بیل اورنگ زیب کے اسلاف ڈال چکے تھے۔ لیکن خود اورنگ زیب کی زندگی ہی میں اُس کے بظاہر مذہبی رنگ، اور پھر دکن کی جانب اُس کی لشکر کشی سے یہ بدظنی پیدا ہو چلی تھی کہ شہنشاہِ عالمگیر کا مقصد کچھ اور ہی، ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی بات رہی ہو۔ لیکن اس کے متعلق کوئی قطعی ثبوت میرے یا کسی کے پاس نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اُن واقعات سے کام ہے جو اُردو ادب پر اثر انداز ہوئے نہ کہ مورخ کے ذیلی بکھیڑوں سے۔

واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کی موت کے بعد ہندستان میں کوئی مرکزی حکومت باقی نہ رہی۔ بڑے، بڑے صوبہ دار اپنی اپنی جگہ وسیع علاقوں کے مالک بن بیٹھے۔ مرہٹوں نے چنگیز خانی انداز میں اپنی ایک بے ڈھنگی حکومت قائم کی، اور اپنی لوٹ مار سے چاروں طرف ایک ابتری مچا دی۔ اس بدنظمی کو دیکھ کر ہمندر پار کے بیوپاریوں کے دل میں بھی راج پاٹ کی سمائی۔ پہلے پہل تو فرانسیسیوں کی کمان چڑھی ہوئی تھی لیکن بعد کو انگریزوں نے فرانسیسیوں کو بیدخل کر کے ہندستان کی منتشر سیاست پر اپنی قیادت کا سکہ جمایا اور رفتہ، رفتہ تاجری سے تاجداری کے رتبے تک پہنچے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے

ہنگامے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا سہاگ اور راج پاٹ ملکۂ وکٹوریہ کو ملا۔

غرضکہ اورنگ زیب کی موت سے ہنگامۂ غدر (یعنی کامل ڈیڑھ صدی) تک ہندستان میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ چاروں طرف انتشار اور تباہی کی گرم بازاری تھی۔ اورنگ زیب کے اخلاف سب کے سب نکمّے اور نام کے شہنشاہ تھے جو باری باری سے کبھی مرہٹوں اور کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں ناچتے رہے۔ کبھی بُری طرح زک اُٹھائی اور کبھی سفاکوں کی سفاکی کے تختۂ مشق بنے۔ بعض بے فکرے، بیحیائی کا جامہ پہن کر تعیش اور ناچ رنگ میں پڑ گئے۔ بعضوں نے جو کچھ سنجیدہ مزاج تھے، شعرا کی مجازی شراب اور عشق و عاشقی میں اوقات گذاری کی۔ یہی رنگ اُردو شاعری میں جھلکتا ہے جسکی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ہنسنے، بولنے، یا رونے، رلانے کے لئے ہے۔ مصیبت سر پر کھڑی ہے، جو کچھ بھی لمحے سکون و اطمینان کے ہیں اُنھیں ہنس بول کر یا آہ و زاری میں گزار دو۔ خدا جانے کل کیا ہو۔ فارسی شعراء کی طرح اردو کے شعرا کا معشوق بھی ایک سنگدل ہلاکو یا مرہٹا پیشوا ہے جو ہر وقت عاشق پر ظلم توڑنے اور اُس کا گلا دبوچنے پر تلا رہتا ہے۔ اگر عاشق اپنی صفائی میں زبان ہلانے کی کوشش بھی کرے تو کس

امید پر جبکہ "بات پر واں زبان کٹتی ہے"۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کی چالبازیوں نے محض ایک فوجی بغاوت کا رنگ دیدیا تھا۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ سازش کاروں نے انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں کو اپنی غلط بیانی سے یہ باور کرایا کہ فرنگی بندوقوں کی کارتوسوں میں سُور اور گائے کی چربی ملادی گئی ہے۔ اس پر سِدھڑ سپاہی مشتعل ہوگئے۔ لیکن اب ایک عامی بھی یہ جانتا ہے کہ اس سادہ بیانی میں پُرکاری کو زیادہ دخل تھا۔ ہے یہ کہ سپاہیوں کی اس سادہ بیانی کی تہ میں بڑے گہرے اور دوررس جذبات کارفرما تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بغاوت کے لئے ظاہراً یہ بہانہ اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن اصل میں باغی سپاہیوں کی یہ بغاوت اُس بے چینی اور نفرت کی آگ کا پتہ دے رہی تھی جو سینوں اور دلوں میں ایک "تاجرانہ حکومت" کے خلاف سُلگ رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں سے لوگ باخبر ہو چکے تھے۔ مرہٹوں کی قوت کچل کر رکھدی گئی تھی، ٹیپو کا ایک ہولناک ٹریجڈی پر خاتمہ ہوا۔ واجد علی شاہ مٹیا برُج میں نظر بند تھے۔ لال قلعہ کا ایک بے کس تاجدار بساط پر

باقی رہ گیا تھا۔ آثار کہہ رہے تھے کہ وہ بھی گھڑی پل کا مہمان ہے۔
آخر کار نا عاقبت اندیش اور نادان سپاہیوں نے اعلان بغاوت کے ساتھ بہادر شاہ کو اپنا بادشاہ مقرر کیا۔ بڑی گرما گرمی کے ساتھ انگریزوں کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ کر ہندستان کو پاک کرنے کے منصوبے ہونے لگے۔ کچھ دیر کے لئے انگریزوں کے قدم اُکھڑ گئے، لیکن ایک غیر منظم فوج کہاں تک منظم حربوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا۔ بلا گئی اُس بیکس کے سر، جس کے یہ الفاظ اب تک ہندستان کی پھوٹ بغاوت کا پتہ دیتے ہیں:-

دمدمے میں دم نہیں، اب خیر مانگو جان کی
اے ظفر، ٹھنڈی ہوئی تلوار ہندستان کی

ہندستان کی تلوار ٹھنڈی ہوئی۔ دانائی پہلوانی پر غالب آئی، اور انقلاب کی غیر منظم رَو دھیمی پڑی۔ لیکن بیداری کا احساس باقی رہا۔ یہیں سے اُردو شاعری کا نیا دَور شروع ہوتا ہے جس کا پیشرو جہان آباد کا وہ فلسفی شاعر ہے جس نے غدر کے حالات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے، اور جس نے غزل کے ساز میں ہندستان کے مٹتے ہوئے تمدن کا جا بجا نوحہ کیا ہے اور آنے والی پود کو اپنی پیش بینیوں سے اُفق

سیاست کے بدلتے ہوئے رنگ سے باخبر کیا ہے:۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار، اگر تمہیں ہوسِ نائے ونوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور وسوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب کے ان دھندلے نقوش میں بعد کے نقاشوں (حالی، اکبر) اور خصوصاً اقبال نے حالاتِ زمانہ کے مطابق رنگ بھرا ہے۔ اور یہاں سے اردو شاعری زندگی کے وسیع تر مسائل کی حال اور قومیت کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اقبال کو ان سب پر

برتری اس طرح حاصل ہے کہ اقبال نے جس تفصیل کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک کے دُور رس مسائل پر نظر ڈالی ہے، اور ہندی نوجوانو کو جو ولولہ انگیز پیغام دیا ہے، ہندستان کے کسی شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ اس معاملے میں اُس کے ذاتی جوہر کے علاوہ ہندستان کے سیاسی حالات اور مغربی علوم سے آگہی نے بھی اُس کی ایک حد تک مدد کی۔

جس زمانے میں اقبال نے اپنی خداداد ذہانت کا پورے طور پر احساس کیا ہے، ہندستان کی سیاسی فضا حُرّیت اور ہوم رول کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ اصلاحی اور تعمیری تحریکیں بھی زوروں پر چل رہی تھیں۔ سرسید کی پُرخلوص خدمات برگ و بار لا رہی تھیں۔ حالی کی نوحہ خوانی سے نیند کے ماتے بیدار ہو رہے تھے۔ غرضکہ یہ کچھ سیاسی اور سماجی حالات تھے جبکہ اقبال نے ایک نئے انداز میں قومیت کا راگ گایا جس کے آگے حالی کی نوا پھیکی پڑ گئی۔ ہندستان ہمارا، نیا شوالہ، میرا وطن وہی ہے اور تصویرِ درد اسی جوش اور ولولے کا نتیجہ تھیں جس سے اقبال کا وجود پارے کی طرح بیتاب تھا۔ غرضکہ

تمام ہندستان اقبال کی والہانہ تانوں سے گونج اُٹھا۔

اپنی شہرت کا سکہ بٹھا کر ۱۹۰۵ء میں اقبال نے دیارِ مغرب کا رُخ کیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے زمانے میں جب اُنھوں نے یورپ کی گنواں بستی کا (جہاں کچھ توقعات لیکر وہ ہندستان سے چلے تھے) غور سے مشاہدہ کیا، تو اُنھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ وہی قومیت جس کا انھوں نے شد و مد کے ساتھ راگ گایا تھا، یورپ میں خاصی بدنام اور خودغرضی کی ہم معنی ہو چلی تھی۔ جغرافی حد بندیوں نے نسل و رنگ کے امتیازات پیدا کر کے، انسانوں کو تنگ نظر اور خودغرض بنا دیا تھا۔ جمہوری حکومت کی باگیں اصل میں سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھیں جو نہایت بیدردی کے ساتھ غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ یورپ کی ہوسناکی کا یہ منظر دیکھکر اُنھیں مغربی تمدن اور مغربی اوضاعِ حکومت سے گہری بدظنی اور نفرت ہو گئی۔ چنانچہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں جو اشعار اقبال نے اپنے دوست (سر) عبدالقادر کے رسالے (مخزن) کے لئے بھیجے تھے۔ اُن سے اقبال کے اس بدلتے ہوئے رجحان کا پتہ لگتا ہے جو آیندہ چل کر اُن کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع بننے والا تھا:-

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

جیسے، جیسے یہ نفرت اور بیزاری بڑھتی گئی، وہ یورپ کی نام نہاد قومیت سے دامن بچا کر، ملیت کی طرف کھنچتے گئے۔ ملیت سے مراد ہے انسانی برادری اور مساوات کا وہ اعلیٰ تصور جو نسل و رنگ اور جغرافی حد بندیوں سے بالاتر ہے اور جس کی رُو سے بنی نوع انسان بھائی، بھائی ہیں۔ خواہ وہ ہندستان میں بستے ہوں یا ایران و چین میں۔ یہی وجہ ہوی کہ جب ۱۹۰۸ء میں اقبال یورپ سے لوٹ کر ہندستان آئے تو اپنے اگلے ہندی ترانے کے جواب میں انھوں نے "سارا جہاں ہمارا" کا راگ الاپا۔

اس پر بعض حلقوں میں بڑا غل غپاڑہ مچا کہ اقبال اب وہ نہیں رہے۔ دراصل یہ سمجھنے والوں کی سمجھ کا پھیر تھا۔ ورنہ اس سے اقبال کا مقصد کچھ اسلام کا پرچار کرنا نہ تھا بلکہ صرف یہ جتلانا مقصود تھا کہ ہمیں قومیت کے اس محدود اور شر انگیز تصور کو چھوڑ کر انسانیت

اور انسانی برادری کا اعلیٰ تصور نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے، تاکہ ہم بھی اُس تنگ نظری کے شکار نہ ہو جائیں جس میں یورپ مبتلا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس زمانے میں اقبال نے یہ راگ الاپا تھا، اُسی زمانے میں ترکی اور دوسرے اسلامی یا مشرقی ممالک، یورپ والوں کی جالبازیوں سے خطرے میں تھے۔ منصوبے ہو رہے تھے کہ اِدھر ترکی کی تُرکی تمام کر دیجائے اور اُدھر ایران کو مل بانٹ کر ہضم کر لیا جائے۔ غرضکہ مشرقی اقوام کو غلام بنانے کے یورپ میں خفیہ مشورے ہو رہے تھے۔ ان حالات میں تمام مسلمانوں کو ایک دل اور یک جہت کرنے کی خاطر اگر اقبال نے ایک اعلیٰ انسانی فرض ادا کیا تو اس میں بُرائی کیا تھی؟ بحیثیت ہندستانی اگر اُن کا دل ہندستان کی غلامی کو دیکھ کر بیتاب تھا تو بہ حیثیت ایک مسلمان اور انسان کے اسلامی ممالک کی زبوں حالی پر بھی اُن کا اضطراب یقیناً حق بہ جانب تھا۔ اس میں بدگمانی کی کیا بات تھی؟ آج بھی حبش کی تباہی اور چین کی زبوں حالی اور شام و فلسطین کی بے چینی پر ہمیں دُکھ ہوتا ہے، تو کیا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہندستان کے لئے ہمارے دل میں جگہ نہیں؟

غرضکہ جس زمانے میں اقبال نے وہ نظمیں لکھیں جن میں قومی رنگ کے خلاف ملی رنگ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں ترکی اور ایران کو ہڑپ کر جانے کی خاطر یورپ میں طرح طرح کے منصوبے ہو رہے تھے۔ غور سے اگر دیکھئے تو انھیں ممالک کی فلاح پر تمام ایشیا کی نجات کا مدار ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد جو واقعات نگاہوں کے سامنے آئے، اُن سے اقبال کی دوربینی کا صاف ثبوت ملتا ہے کہ یورپ کے بدنیت سیاست دانوں کے ذہن کی گہرائیوں میں دراصل کیسے خیالات بسے ہوئے تھے۔

سیاست عالم کے ان دُور رس مسائل کو نظر کے سامنے رکھ کر، اگر آپ اقبال کے کلام کو پڑھیں تو آپ پر روشن ہو گا کہ اقبال ہرگز تنگ نظر نہیں ہے۔ وہ ہندستان سے بھی محبت رکھتا ہے، اور ہند سے گزر کر، تمام ایشیا اور اقوام ایشیا سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اُسکی نظریں سیاست عالم پر ہیں اور مغرب کے سیاسی شعبدہ بازوں کی عیاریوں کو وہ خوب سمجھتا ہے۔ وہ، ایشیا والوں کو ہر نازک موقع پر قبل از قبل بیدار اور باخبر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُمید اور مردانگی کا پیغام دیتا ہے۔ ہندستان میں اس وقت کوئی شاعر ایسا نہیں جو

اُس کی جگہ لے سکے۔

[یہ باب کیا، بلکہ کتاب کے بیشتر حصّے کی کتابت ہو چکی تھی کہ اتفاق سے علّامہ عبداللہ یوسف علی کی کتاب "انگریزی عہد میں ہندستان کے تمدّن کی تاریخ" میرے مطالعے میں آئی۔ مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ غدر کے بارے میں اپنے اِس مضمون میں جن تاثرات کا میں نے اظہار کیا ہے، علّامہ موصوف کی کتاب سے بڑی حد تک اُنکی تصدیق ہوتی ہے۔ غدر کے دردناک واقعات اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کی بیدادگری کا تفصیلی مرقع اگر دیکھنا مقصود ہو تو کتاب مذکور کے صفحات (۲۳۷) تا (۲۵۸) بیحد مفید ثابت ہوں گے۔]

(۲)

اقبال کا ذہنی ارتقاء

(اگست ۱۹۳۸ء)

آج اقبال کی شاعری اور اُن کے کمال کے چاروں طرف گُن گائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے حوصلے کے مطابق اُنکی شاعری اور شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سچ کہ اقبال کے جیتے جی بھی لوگوں نے اُن کے مَن موہنے اور دل میں جوش پیدا کرنے والے شعروں کو بہت کچھ سراہا اور جی کھول کر داد دی۔ مگر اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں اُن کی ہر ایک ادا، اُن کی دل میں وہ کھُبنے والی باتیں، اور بھی یاد آتی ہیں۔ قدرِ نعمت بعد زوال!

یہ طرفداری یا بڑ بتائی نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اقبال جیسا شاعر اُردو زبان نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال سے پہلے جتنے شاعر اُردو زبان نے پیدا کئے، اُن میں کوئی گُن نہ تھا۔ مثال کے طور پر انیس اور غالب کو لیجئے جو اقبال سے

کچھ ہی پہلے کے شاعر ہیں۔ دونوں نے اردو کو کہاں سے کہاں پہونچایا۔ یا اکبر اور حالی کو لیجئے جو عین اُس زمانے کے شاعر ہیں جبکہ اقبال نے پر تولنے شروع کئے تھا۔ اکبر کی شاعری کا ہنس مکھ رنگ اور ہنسی ہنسی میں دل میں نشتر چبھونا، یا حالی کا دیس اور قوم کا دُکھڑا بیان کرنا، کون ہے جو نہیں جانتا؟ ان دونوں کے مقابلے میں داغ بھی تھے جو اتنے پائے کے شاعر نہ تھے۔ کہنے کو پرانی لکیر پر چلتے تھے مگر زبان ایسی بانکی پائی تھی کہ سُنئے تو دل لوٹ پوٹ ہوجائے۔ پھر ذرا غور سے دیکھئے تو وہی روندا ہوا خیال، مگر بیان کرنے کا ڈھب ایسا کہ بے واہ واہ کہے بن نہ پڑے۔ یہ بھی شاعری نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آدمی کو آپ پرانی وضع اور دقیانوسی خیال کا آدمی سمجھیں، لیکن جب وہ کچھ کہے تو آپ بے اختیار پھڑک اُٹھیں۔ نہیں، داغ شاعر تھا۔

میں نے یہ سب ذکر یوں ہی بے سبب نہیں کیا۔ ان تینوں چاروں شاعروں کا اثر شروع شروع میں اقبال پر پڑتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنی نومشقی اور تقلید کے دَور سے گذر کر اقبال نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا اور ایک ایسی منزل پر پہونچ گیا جہاں کوئی اُس کا

شریک نہیں۔ اس کے باوجود بھی اقبال نے سدا اپنے پیش رؤوں کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ یہی اُس کی بڑائی کی سچی دلیل ہے۔ اُوچھے ہیں وہ جو اپنے محسنوں کے احسان کو بھول جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ بڑا آدمی ناشکرا نہیں ہوتا۔ اقبال نے غالب، داغ، حالی اور فارسی بان کے بڑے بڑے شعرا کی بڑائی کو مانا ہے اور عقیدت کے طور پر اُن لوگوں پر نظمیں لکھیں ہیں، جن سے اُس کی نیک نیتی صاف جھلکتی ہے۔ خصوصاً غالب، داغ اور حالی پر جو نظمیں "بانگ درا" میں ہیں انھیں پڑھ کر اپنے طور پر اندازہ کر لیجئے کہ ایک بڑا آدمی اپنے بڑوں کی بڑائی ماننے سے کبھی نہیں جھینپتا۔ اور تو اور شیکسپیر پر بھی ایک پیاری نظم ہے۔ حالانکہ شیکسپیر ہماری زبان کا شاعر نہیں۔ اسی طرح بعض ہندو بزرگوں اور ہندماتا کے سپوتوں پر بڑی بانکی اور منوہر نظمیں لکھی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، رام چندر جی، لکشمن جی، اور گرونانک پر جو اشعار لکھے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض مسلمانوں ہی کا شاعر نہ تھا بلکہ سچے معنوں میں بھارت اور بھارت باسیوں سے ایسی سچی چاہت رکھتا تھا جس میں کہیں بھی پھوٹ اور نفرت کی بُو نہیں۔ جن لوگوں نے اقبال کو فرقہ پرست سمجھا ہے انصاف اور نیائے

کا خون کیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہونچی۔ مگر خیر میں نے بگو اس سے کام نہیں لیا۔ یہہ پہلو بھی اُجاگر کر دینا ضروری تھا۔ اسلئے کہ جو باتیں کسی شاعر کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد دیں وہ بھی ضروری ہوتی ہیں۔

بہرحال اکبر اور حالی اور خاص طور پر حواغ اور حالی کی شاعری کا ہندستان کے چاروں کھونٹ غلغلہ تھا جبکہ اقبال نے اپنی شاعرآ صلاحیت کا احساس کیا اور چپکے چپکے شعر کہنا شروع کیا۔ ابھی اپنی جنم بھومی سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ اردو کے تمام ہونہار شاعروں کی طرح پہلے پہل غزل گوئی ہی سے شاعری کی ابتدا کی۔ داغ کی شاعری اور زبان دانی کی چاروں طرف دھوم تھی۔ وہی عاشقانہ رنگ اختیار کیا۔ دہلی اور لکھنو کی زبان سے مرعوب تھے۔ پنجاب اور سیالکوٹ تو خیر، یہاں کی زباندانی تو کسی شمار قطار میں نہ تھی۔ ہندستان کے دوسرے علاقے جہاں اُردو کا چرچا تھا، دہلی اور لکھنؤ سے سند لیتے تھے۔ ایسی صورت میں اقبال کسی اہل زبان کا دامن نہ تھامتے تو کیا کرتے۔ لامحالہ استاد داغ کا دامن تھاما اور اُن سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں تک خط و کتابت کے ذریعے یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کو داغ نے سیر چشمی سے کام

پیام بیکر ہمت بندھائی اور لکھا کہ تمھیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں تم جوہر قابل رکھتے ہو اپنی طبیعت کے بہاؤ پر چلو۔ خود ہی اپنا راستہ نکال لو گے۔

اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کیسے جوہر شناس تھے۔ سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس ہو کر اقبال لاہور آئے تھے، بی۔ اے۔ میں پڑھ رہے تھے، شعر گوئی کا سودا زوروں پر تھا، غزلیں کہتے تھے اور بعض اوقات خوب مضمون نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر سنیئے۔ لاہور میں ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جس میں اُس زمانے کے خاص خاص شاعر جمع تھے۔ اقبال کے بعض بے تکلف دوست اُنھیں جبراً یہاں لے آئے۔ اور غزل پڑھنے پر مجبور کیا۔ میرزا ارشد گورگانی میر مشاعرہ تھے۔ جب اقبال نے اپنی غزل کا ایک شعر پڑھا تو بے اختیار پھڑک اُٹھے۔ شعر تھا:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی غزل کا مقطع بھی ہے جو ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اور جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہونے والا ایک بڑا شاعر کس قدر اپنے پر بھروسہ رکھتا ہے۔ حالانکہ بڑائی کی منزل ابھی دور ہے:-

ہم کو تو لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہے غرض
اقبال ہم اسیر ہیں زلفِ کمال کے

کتنے پیمبرانہ الفاظ تھے جو ایک فیضانی کیفیت میں اقبال کی زبان سے نکلے۔ اُس وقت کے سُننے والوں نے اِسے محض شاعرانہ بڑ اور تعلّی سمجھا ہوگا۔ لیکن ہونے والے اقبال نے جس کی شہرت ہندستان سے باہر دُور دُور پہونچنے والی تھی، بعد کو یہ ثابت کر دکھایا کہ زباندانی کا طلسم یوں توڑا جاتا ہے۔ خادمِ زبان اور ادیب ہونے کے لئے جوہرِ قابل کی ضرورت ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اُلانگنا ضروری نہیں۔

لیکن زبان کے اُلجھیڑوں سے آزاد ہونے سے پہلے اور بعد بھی اقبال ایک زمانے تک غالب کے زیرِ اثر رہے۔ گو کہنے کو انھیں داغ سے تلمذ تھا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاگرد تھے۔ اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمّہ ہے۔ اقبال غالب کے اتنے گرویدہ کیوں تھے؟ اس کے کئی ایک سبب ہیں۔ غالب کی طرح اقبال بھی جدّت اور انوکھے پن کے حامی تھے۔ غالب ہی کی طرح فلسفیانہ طبیعت پائی تھی۔ فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعے نے اُن کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا کر دی تھی۔ انگریزی زبان و ادب اور مغربی

علوم کی واقفیت نے مختلف اسالیب پر عبور حاصل کرنے میں انکی مدد کی تھی۔ جرمن کی واقفیت کے باعث جرمن ادب کے شاہکاروں پر براہ راست اُنھیں عبور حاصل تھا۔ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے اور اس طرح سنسکرت لٹریچر کا بھی اچھا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی کا پوچھنا کیا "بیا دریدگر ایں جا بود زباندانی" کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ کر دکھایا کہ ایک مغرور ایرانی بھی اُن کا نام ادب سے لیتا ہے۔ غرضکہ اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے عالم بھی تھے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ شاعری اُن کی کنیز بن کر رہی۔ یہ جامعیت اردو کے شعرا تو کیا دُنیا کے اور باکمالوں میں بھی مشکل سے ملیگی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ جن چیزوں کی غالب کی شاعری میں کمی تھی، اقبال نے اس کو پورا کیا۔

البتہ ایک حیثیت سے اقبال کا رتبہ غالب سے گھٹا ہوا ہے میں نے ایک جگہ بیان کیا ہے: "اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ اسی میں اُس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے"۔ فلسفہ کو شعر بنانا واقعی کمال ہے۔ غالب نے بڑی حد تک یہی کیا ہے۔ وہ صد فی صد شاعر تھا اور ہر رنگ میں شاعر رہتا ہے۔ کبھی خشک فلسفی نظر نہیں آتا۔ لیکن اقبال

بعض اوقات فلسفہ نا دیدنے لگتے ہیں۔ یہیں اُن کی شاعری واعظانہ روپ اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ اُن کے آخری دور کی شاعری کا رنگ بالکل واعظانہ اور مذہبی ہے۔ "بالِ جبریل" کے بعض مقامات، اور "ضربِ کلیم" اور "پس چہ باید کرد...." کے بیشتر حصّے اسی قبیل کے ہیں، جہاں بے رس فلسفے اور مذہب کا پرچار کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے مخالفین کو اعتراض اور بدگمانی کا موقعہ ملا۔ غالب اس کے برخلاف ایک بے لاگ فلسفی، ایک آزاد مشرب انسان، اور ایک بلند نظر شاعر نظر آتا ہے۔

بہر حال اقبال اور غالب کے موازنے کا یہ موقع نہیں۔ اتنی بات نظر کے سامنے رہے کہ ابتدا میں ایک زمانے تک اقبال غالب کے زیر اثر رہے اور نومشقی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی جبکہ غالب کی عقیدت مندانہ تقلید چھوڑ کر انھوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا تھا، یہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے غالب کے دیئے سے دیا جلایا اور جس منزل پر غالب نے چند ناتمام نقوش چھوڑے تھے، اقبال نے وہاں سے ابتدا کی اور چند اضافوں کے ساتھ اُسے بام تکمیل پر پہونچایا۔ ہندستان میں ابھی تک کوئی شاعر ایسا نہیں جو اُن کی جگہ لے سکے۔

انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "شاعر اپنے عہد کا بچہ ہوتا ہے"۔ عہدِ ماضی کا جو اثر اقبال پر ہوا، وہ تو ابھی میں بتا چکا۔ اس انگریزی مقولے کی روشنی میں اب یہ بتانا ہے کہ "اپنے عہد" کا اقبال پر کیا اثر ہوا۔ اس مضمون کا بقیہ حصّہ اسی رُخ کی تصویر ہے۔

جس زمانے میں پورے طور پر اقبال نے اپنی شعری استعداد کا احساس کیا، ہندستان کی سیاسی فضا قومیت اور آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ تلک اور گوکھلے "ہوم رول" کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی اور برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا۔ پھر بھی خاصے جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ دھواں دھار تقریریں سیاسی پلیٹ فارم پر ہو جایا کرتی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی قومیت کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ سرسید کی پُرخلوص کوششیں بار آور ہو چکی تھیں۔ حالی کی نوحہ خوانی کچھ رنگ لا رہی تھی۔ "اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے" کی تان سے مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا احساس ہو چلا تھا۔ گو "قلب کو گرمانے" اور "روح کو تڑپانے والی" آواز ابھی فضا میں پیدا نہ ہوئی تھی، اور دعاؤں نے "شکوہ" کا رنگ اختیار نہ کیا تھا۔ تاہم بھارت کا یہ تھکا ہارا قافلہ بھی چونک رہا تھا۔

غرضکہ یہ کچھ سماجی اور سیاسی حالات تھے۔ یہ تذبذب اور انتشار کا زمانہ تھا، جبکہ اقبال نے چند نظمیں مثلاً ہندی ترانہ، نیا شوالہ، ہمالہ، میرا وطن وہی ہے اور تصویر درد جیسی نظمیں لکھیں، اور تمام ہندستان اس نئے شاعر کی والہانہ تانوں سے گونج اُٹھا۔

ان نظموں کے علاوہ جو ملک کی سیاسی حالت کی ترجمانی کرتی ہیں اس دَور کی چند اور نظمیں بھی ہیں جو اقبال کی افتادِ طبیعت، ذہنی بے چینی، تجسّس اور تلاش کا پتہ دیتی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ابھی اپنی زندگی کا مقصد پایا نہیں۔ خودی کا احساس ابھی تیز نہیں ہوا اور وہ اسرار اس پر منکشف نہیں ہوئے جن سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ، وطنیت اور دیس کی چاہت کے سہانے گیت گا کر دلوں کو گرماتا ضرور ہے لیکن خود اُس کے دل میں تذبذب اور شکوک کا ایک طوفان برپا ہے۔ اُس کا دل سراپا تجسّس اور استفسار بنا ہوا ہے۔ زندگی اور حقایق زندگی کا وہ بھید پانا چاہتا ہے۔ چاروں طرف اُس کی نگاہیں پڑتی ہیں مگر کسی طرف سے اُس کی دل جمعی نہیں ہوتی کہیں گُل کی رنگینی کو دیکھ کر وہ حُسن کی کشش کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے کہیں شمع و پروانے کی دل سوز حکایت میں وہ حُسن و عشق کی حقیقت پانے کی

دُھن میں رہتا ہے۔ کبھی فرازِ آسمان پر مہر و ماہ کی جانب اُس کی نظریں دوڑتی ہیں۔ لیکن کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں پاتا، گو بظاہر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے دل کو سمجھانے کے حیلے بہانے تراش لیتا ہے۔ گل رنگیں، شمع و پروانہ، بچہ اور شمع، آفتاب، ماہِ نو، جگنو، چاند، ستارے، کنارِ راوی، موجِ دریا، یہ تمام نظمیں غور سے پڑھئے۔ آپ کو اقبال کی اس تلاش اور بے چینی کا اندازہ ہو جائیگا۔ یہ سب جستجو محض اس لئے تھی کہ اقبال اپنے لئے ایک بڑا نصب العین اور مقصدِ حیات متعین کرنا چاہتے تھے۔ ایک نئے راستے کی لگن اُن کے دل میں تھی۔ وہ مفسرِ حیات بننا اور زندگی اور موت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی انھیں اپنے پر کامل بھروسہ نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی پورے طور پر اُنھوں نے خود کو پہچانا ہے۔ ابھی ابھی جن نظموں کے عنوانوں کا حوالہ میں نے دیا ہے، اُن کے کچھ اشعار سنئے۔ آپ کو بہتر اندازہ ہوگا کہ میں کس چیز کی طرف اِشارہ کر رہا ہوں +

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حُسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن
رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس

ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

(بچہ اور شمع)

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو، رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

(گلِ رنگیں)

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے، لیکن کھڑا ہوا ہوں میں

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موجوں سے ملّاح جس کی گرم ستیز

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا

نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(کنار راوی)

میرے حق میں تو نہیں تارونکی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا، عدم آباد، وطن ہے میرا
صبح کا دامنِ صد چاک، وطن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقیٔ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

(ستارۂ صبح)

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا
نظارۂ شفق کی خوبی زوال پر تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی روشنی دی
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا

واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے
ہر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہے

(جگنو)

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اُٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

(چاند)

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(موجِ دریا)

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیمابِ پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

(ماہِ نو)

یہ ناصبوری، یہ تڑپ، یہ ذوقِ آگہی، یہ نور کی طلب، اور یہ وسعت کی خواہش، سب کیا ہے؟ وہی ایک اعلیٰ نصب العین کی تلاش جسکی صلاحیت شاعر خود میں ابھی نہیں پاتا۔ غرضکہ کچھ اس قسم کی کھٹک اور خلش دل میں لے کر کہ اقبال یورپ کا عزم کرتے ہیں اور دیس کو خیرباد کہنے سے پہلے حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ وہاں پہونچکر یہ بند جذبات پھوٹ پڑتے ہیں۔ چنانچہ اپنی منظوم التجا میں اِس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اس خیال سے یورپ جا رہے ہیں کہ شاید وہاں کی گنجان بستی میں انھیں اپنے ذوقِ استفہام کا جواب اور دل کی اس بیتابی کی دوا ملے:-

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھکو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو
نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھکو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھکو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھکو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

یہ طلب اور یہ ارادے لے کر ۱۹۰۵ء میں اقبال ہندستان سے رخصت ہوئے اور اِن تاثرات پر اس دور کی شاعری کی تان ٹوٹتی ہے۔ بعد میں اقبال کی شاعری نے جو پلٹا کھایا، اُس کے اسباب کچھ اور ہیں جنکی تفصیل اپنی جگہ پر آئیگی۔

البتہ ایک چیز خاص طور پر نظر کے سامنے رکھنی چاہیئے جو اس دور کی شاعری میں بھی نمایاں ہے، اور آنے والے دور کی شاعری میں اور بھی شدت کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر آخر میں وہ

ایک پیمبرانہ روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس خاص چیز سے میری مراد ہے اقبال کا گہرا مذہبی رنگ۔ مذہب اُن کی گھٹی میں تھا اور جس صوبے کی آب و گِل سے اقبال کی سرشت کا خمیر بنا تھا، مذہبی اعتبار سے پورا صوبہ اور علاقوں کے مقابلے میں شدّت کے ساتھ مذہبی عصبیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہوی کہ موجودہ حالات میں اقبال کا لہجہ بہتوں کیلئے غلط فہمی کا باعث ہوا اور بعض قوم پرستوں نے یہ سمجھا کہ ع

"محفل کا وہ رند پُرانا آج نمازی بن بیٹھا۔" اصل حقیقت سچ پوچھئے تو یوں نہیں ہے۔ یہ اُن کا نہیں بلکہ سمجھنے والوں کی سمجھ کا قصور تھا۔

اپنے تین سالہ قیام (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸ء) کے زمانے میں جبکہ اقبال کچھ توقعات لے کر شرابِ علم کے حصول میں نگارخانۂ وطن سے یورپ کی سرزمین پر پہونچے اور وہاں کے حالات اور رنگ ڈھنگ کا غور سے مطالعہ کیا، تو اُنھیں بڑی مایوسی ہوی۔ قومیت جس کا پودا ہندستان میں لگایا جا رہا تھا، یورپ میں خاصی بدنام اور خود غرضی کی مترادف ہو چکی تھی۔ جغرافی حد بندیوں نے نسل و رنگ کے امتیازات پیدا کر کے انسانوں کو تنگ نظر بنا دیا تھا۔ مادّیت اور مادہ پرستی نے انسان کو انسانی ہمدردی اور روحانی و اخلاقی مسائل سے بیزار اور بے بہرہ

کر دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ جو کچھ ہوا اور جو کچھ کیا جائے، سب اپنی ہی بھلائی اور ذاتی نفع کے لئے ہو۔ جمہوری نظام کی باگیں خطرناک قسم کے بینوں اور خونخواروں کے ہاتھ میں آ گئی تھیں اور سرمایہ دار بڑی بیدردی کے ساتھ غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ اپنے حصولِ مقصد کے لئے قومیں قوموں کے خلاف، جماعتیں جماعتوں کے خلاف، اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف آستینیں چڑھا کر موقع کا منتظر تھا۔ جنگِ عظیم کے ڈراؤنے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ تنا تنی کچھ رنگ لانے والی تھی۔

اِن حالات میں اقبال نے دیکھا کہ یہ قومیت اور وطنیت کا بھوت انسانوں کو درندوں سے بدتر بنا کر رہے گا۔ غرضکہ قومیت، برابری، اور تہذیب و شائستگی کے سُہانے گیت گانے والی یہ قومیں ایک طرف تو اپنوں ہی کے حلق پر خنجر چلانے پر تُلی بیٹھیں تھیں، اور دوسری طرف یہ منصوبے ہو رہے تھے کہ جس طرح بن پڑے اپنے حصولِ مقصد کی خاطر مشرقی اقوام کو آہستہ آہستہ ہڑپ کر لیا جائے اور بسم اللہ ٹرکی اور ایران سے کی جائے۔ اسی مقصد کے مدِنظر ٹرکی کے خلاف بلقان اور اٹلی کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں برطانوی سیاست کا بھی در پردہ ہاتھ تھا۔ "مریضِ یورپ" کا اِدھر یہ حال تھا، اُدھر برطانیہ

اور روس کی سیاسی رسہ کشی سے ایران کی جان کے لالے پڑے تھے۔ ان واقعات اور احساسات کی تھوڑی سی جھلک آپ کو اقبال کی اُس نظم میں دکھائی دیگی، جس کا عنوان ہے "ہلال عید"۔ چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں:۔

"قافلے دیکھ اور اُن کی بَرق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، اِن کی گرفتاری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ، آبرو والوں کی، تو
اور جو بے آبرو تھے اُن کی خودداری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

غرضکہ اِن اسباب کی بنا پر اسلامی ممالک کی فلاح اور بہبودی کی خاطر وہ تحریک شروع ہوی جسکو ہمہ اسلامی تحریک یا "پان اسلامزم" کہتے ہیں۔ اپنے قیام یورپ کے زمانے میں اقبال اس تحریک کی معقولیت سے آشنا

ہو چکے تھے۔ اور اپنی آنکھوں سے یورپ کی ہوس کاری اور بدنیتی کا منظر دیکھ کر، انھوں نے "ہمہ اسلامیت" کو اپنی شاعرانہ سحر کاریوں کا موضوع بنانے کی دل میں ٹھان لی، اور مشرقی اقوام کے سامنے قومیت اور عالمگیر برادری کا اعلیٰ تصور پیش کیا۔ پھر اپنی شاعری کے لئے وسیع تر میدان پیدا کرنے کی نیت سے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی رواداری، اسلام کا شاندار ماضی، اور اقوامِ عالم پر اُس کے عظیم احسانات، یہ سب ایسی کھلی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اقبال نے اسلامی ممالک کو اُن کے شاندار ماضی سے رُوشناس کرا کے، اگر اُن کے سینوں میں عمل اور بیداری کی لہر دوڑا دی تو بُرا کیا کیا؟ پھر یہ کہ گو لَے حجازی تھی، مگر کاہل رگوں میں خونِ حرارت دوڑانے میں یہ نوا سب کے لئے برابر تھی۔ اس میں ہندی اور ترکی، عجمی اور تازی، یا ہندو اور مسلمان کی کچھ تخصیص نہ تھی۔ لیکن سینوں کے کھوٹ نے اس درد اور خلوص بھری آواز کے معنی ہی کچھ اور لئے۔ اور جس طرح ایک غلط فہمی یہ پھیلی کہ اقبال اُردو سے بیزار ہو گئے، اُسی طرح بعض حلقوں میں یہ بدظنی بھی عام تھی کہ اقبال قوم پرست سے مسلم پرست اور ہوتے ہوتے کٹر فرقہ پرست

ہو گئے، حالانکہ اقبال کا پیامِ عمل اور بیداری کا سندیس سربچے لئے ہے۔ جس طرح زبان (اُردو سے فارسی) بدل گئی تھی مگر دل وہی تھا، اسی طرح قومیت کا ڈھانچہ بدل سا گیا تھا مگر روح وہی تھی۔ بھلا جو شاعر قومیت اور رنگ، نسل اور ذات پات، اور برتری اور کمتری کے جھگڑے مٹانے آیا تھا، کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست ہو؟ ہے یہ کہ اس معاملے میں بڑی غلط فہمی ہوئی اور کوئی اللہ کا بندہ بروقت ایسا نہ کھڑا ہوا کہ اس بدظنی اور غلط فہمی کو اقبال کے جیتے جی دور کرتا۔ اس چیز نے اقبال کی مقبولیت اور شہرت کو بڑا صدمہ پہنچایا اور اُسے اپنی زندگی میں وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

بہرحال یہ اسباب ہوئے کہ اقبال نے "قومیت" کو چھوڑ کر "ملّیت" کا راگ گایا اور مغرب کی عقیدتمندی کو تج کر، اُس کے خلاف جہاد شروع کیا اور چُن چُن کر اُس کے عیب گنوائے۔ چنانچہ تمام یورپ کی چند نظموں کو چھوڑ کر (جن میں تشکوک، تجسس، اور تلاش کا رنگ گہرا ہو گیا ہے) بعد کے دور کا تمام کلام یورپ کے خلاف احتجاج، اور قومیت اور جمہوریت سے بیزاری کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی اُن کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع ہے۔

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ایران کے مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں اور لٹریچر کو غور کی نظر سے دیکھا تھا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تہذیب کی ابتری اور تباہی کی ذمہ دار فارسی شاعری بھی تھی جس نے افلاطونی فلسفے کی موشگافیوں میں پھنس کر، حیات کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ سکون اور بے عملی کو مقصدِ حیات تصور کیا جانے لگا۔ افراد میں خودی اور خودداری کی بُو نہ رہی اور ذلّت و نکبت موجبِ فخر سمجھی جانے لگی۔ یہ روگ آہستہ آہستہ پوری قوم اور ملت کی رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ اُردو ادب کچھ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ ایک تو براہِ راست فارسی شاعری کے اثر سے اور پھر (سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد) اُس دیس کے عام اثرات کی وجہ سے جو صدیوں غلامی میں بسر کر چکا تھا اور اہمسا اور تیاگ جسکی رگوں میں بسا ہوا تھا، اس مجہولیت نے ہندوستان میں بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ اس مجہولیت کے خلاف جہاد کرنا اور ہندیوں کی رگوں میں خونِ حیات اور عمل کی برقی لہر دوڑانا، اقبال کے نزدیک ازبس ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اُنھوں نے اپنا منظوم دستورالعمل مرتب کیا جو "اسرارِ خودی"

اور "رموزِ بے خودی" کے نام سے مشہور ہے۔ اسرار و رموز کا فلسفہ علاوہ اسلامی ممالک کے ہندستان کے لئے ایک خصوصی اپیل رکھتا ہے۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اوراق کی ترتیب سے پہلے اقبال نے کئی ایک پُرجوش نظمیں لکھیں جن سے اُن کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کا پتہ لگتا ہے۔ ان نظموں میں بعض اُس زمانے کی ہیں جبکہ جنگِ بلقان کے شعلوں کا دُھواں ہندستان تک پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ شکوہ، فاطمہ اور جواب شکوہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو مسلمانوں کے اُمنڈتے ہوئے جذبات اور اُس ذہنی ہیجان کی ترجمانی کرتی ہیں جو ٹرکی کی بقا اور فنا کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ شکوے اور جواب شکوے میں نام نہاد قومیت پر کچھ چوٹیں بھی ہیں اور اس کے برخلاف اُس عالمگیر اخوت اور سنسار برادری کی طرف اشارے بھی ہیں جو نسل، رنگ، اور دوسرے بکھیڑوں سے پاک ہو۔

اسی زمانے میں (سنہ ۱۹۱۲ء) شمع و شاعر لکھی گئی جو اس دور کی نظموں میں سب سے اچھی نظم ہے اور جس کو بانگ درا کا دل کہنا

بجا ہے۔ اقبال کا سارا فلسفۂ خودی یہاں سمٹ کر دل بن گیا ہے۔ فلسفے اور شعر کا یہ خوشگوار امتزاج یا تو یہاں ہے یا پھر بالِ جبریل کے "ساقی نامے" میں جس کا ذکر بعد میں آئیگا۔

اِن طویل نظموں کے علاوہ چند چھوٹی بڑی نظمیں اور بھی ہیں جن میں حیات اور فلسفۂ حیات کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ وہ مسائل جو پہلے اور دوسرے دَور کی نظموں میں شاعر کی نگاہوں میں چیستاں معلوم ہوتے تھے اور اُسکی ذہنی بے چینی کا باعث بنے تھے، اب اُن کا عقدہ کُھلتا جا رہا ہے۔ فرازِ آسمان پر پہلے کی طرح اُس کی نظریں پڑتی ہیں تو وہی چاند اور ستارے جو اُس کی پریشانیوں میں اضافہ کرتے تھے، اپنے سربستہ رازوں کو اب آہستہ آہستہ فاش کر رہے ہیں۔ قدرت کی ہر شئے اسرار کے خزانے اُگل رہی ہے۔ شاعر کے نالے آسمانوں کے اُس پار پہنچ رہے ہیں۔ اور خود شانِ کبریائی جب ازل و ابد کے بھید اُس کے سامنے آئینہ کر رہی ہو تو بھلا اِن چیزوں کی کیا ہستی ہے؟ بہرحال پہلے دَور کی کم و بیش انھیں عنوانوں کی نظموں سے اِن نظموں کا مقابلہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ وہی چاند ہے، وہی شمع، وہی پروانہ، وہی موجِ دریا، وہی کنارِ جو، لیکن جو چیزیں پہلے

گم صُم نظر آتی تھیں، اب ایک مردِ خود آگاہ کے سامنے حقایق اور حقایق زندگی کے اسرار اُگل رہی ہیں۔ ان کو غور سے اپنے طور پر پڑھئے۔ طوالت کے خوف سے میں اِن نظموں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔

غرضکہ اِدھر یہہ سب نظمیں تیزی کے ساتھ لکھی جا رہی تھیں جن میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحانات صاف جھلکتے ہیں، اور اُدھر فارسی زبان میں اسرار و رموز کے تانے بانے بھی درست ہو رہے تھے۔ پہلی مثنوی جنگِ عظیم کے دھماکے کے ایک سال بعد (سنہ ۱۹۱۵ء) اور دوسری اِس دھماکے کے خاتمے سے ایک سال پہلے (سنہ ۱۹۱۸ء) شائع ہوئی۔

دونوں مثنویوں کا بیرنگ، مولانا روم کی لازوال مثنوی پر تیار کیا گیا ہے۔ وہی زبان، وہی بحر، وہی اسلوب، حتیٰ کہ باریک مسائل اور حقایق مجردہ کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے حکایت اور "الیگری" (تمثالیہ) میں بیان کرنے کا ڈھنگ بھی رومی ہی کا ہے۔ پہلی مثنوی کے تمہیدی حصے میں صاف طور پر اقبال نے پیرِ رومی سے اپنی بے اندازہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ چیز ہمیں اچنبھے میں ڈالتی ہے، خصوصاً جبکہ ہم جانتے ہیں کہ بعض چوٹی کے مغربی حکماء (کانٹ۔ ہیگل۔ برگساں وغیرہ) سے اُس نے کچھ نہ کچھ فیض حاصل کیا

ضرور ہے۔ پھر بھی رومی کے مقابلے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور تو اور نطشے کو بھی جس کے فلسفۂ حیات نے ایک حد تک اقبال پر اثر ڈالا تھا، وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ "اُس کا دل تو مومن کا ہے مگر دماغ کافر کا" (ع۔ قلبِ اُو مومن دماغش کافر است)

اقبال نطشے سے اتنا بیزار کیوں ہے؟ اس کے دو سبب ہیں۔

(۱) یہ کہ نطشے میں خاص طور پر اور حکمائے مغرب میں بیشتر، روحانیت کا فقدان ہے اور اقبال شدت سے روحانیت کا قائل ہے۔ اُس کے نزدیک روحانیت کی کمی ہی فساد کی جڑ اور ساری انفرادی اور اجتماعی خرابی کی ذمہ دار ہے (۲) پھر یہ کہ اقبال خود فلسفی تھا۔ نقال تو تھا نہیں کہ بے سوچے سمجھے اُس نے نطشے کے فلسفے کی نقل کی اور اُسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا یہ صاف انکار اور برہمی اس بنا پر ہے کہ سمندر پار کے گنواں پنڈتوں اور خود ہمارے دیس کے بعض مغرب زدہ احباب نے جوشِ ہمہ دانی میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نطشے کی نقل ہے یہ سراسر زیادتی تھی۔ اس لئے کہ گو بظاہر اُس کا فلسفہ نطشے کے فلسفے سے مماثلت کے کچھ پہلو پیش کرتا ہے لیکن محض اس بناء پر اُس کو نطشے کی نقل

نہیں کیا جاسکتا۔ اُس کے (اقبال کے) فلسفے میں چند عناصر ایسے ہیں جو اُس کے اپنے، اور اُس کی لگاتار کوشش اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ "کہیں سے کچھ قرض لینا اور سود بٹے کے ساتھ اصل میں اضافہ کرنا سرقہ ہرگز نہیں!" یہ فتویٰ ہے ملٹن کا جس پر بیدردوں نے کچھ اسی قسم کا بہتان باندھا تھا۔

غرضکہ ہیر پھیر میں بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں جن سے نہ صرف میرے خیال کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں اقبال نے نطشے سے کچھ لیا بھی ہے تو اُسے کیا سے کیا کر دیا۔ "کیا اقبال نطشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ وہ (اقبال) ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اسرار خودی کی حکایت "الماس و زغال" کو لیجئے جو نطشے کی تصنیف (ارشادات زردشت) کی ایک حکایت "پتھر اور کوئلہ" سے ماخوذ ہے۔ مگر چونکہ اقبال نطشے سے بزرگ تر شاعر ہے اُس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اُس کا اپنا بن گیا۔ ..... نطشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔

اُس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جُرأت سے سرفراز کیا ہے۔ اُسکی حیات افروز مثنویوں کا جو حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔۔۔۔۔"

تاہم یہ مثنویاں جا بجا نومشقی کا پتہ دیتی ہیں، خصوصاً رموزِ بیخودی جس میں بے رس فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے اور شعریت کم۔ اپنے شاعرانہ کمال کے بہتر نمونے اقبال نے بعد میں پیش کیے جن کے آگے یہ مثنویاں پھیکی ہیں۔ البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحہ عمل ہونے کی حیثیت سے اِن مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے۔

رموزِ بیخودی کی اشاعت کے ایک سال پہلے (جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا ہے) جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اُس کے اثرات سب پر پڑے۔ جو جیتے اُن کی بھی برائے نام جیت رہی، اور جو ہارے اُن کا تو وارہ نیارہ ہی ہو گیا۔ جو بے تعلق رہے وہ بھی کچھ نفع میں نہ رہے۔ ورسائی میں جرمن قوم کی ابدی غلامی کا سرخط تیار ہوا۔ ترکوں کے آگے کوئی مستقبل نہ رہا۔ قسطنطنیہ پر "اتحادیوں" کی چھاؤنی تھی سلطان وحید الدین خاں کی نام نہاد خلافت صرف جمعہ کے خطبوں کی حد تک

رہ گئی تھی۔ رُوس کے نظامِ زار کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ مشرقِ قریب میں شام و عرب کی خوں آشام سرزمیں دوزخ کا نمونہ بنی ہوی تھی۔ اور برطانیہ اور فرانس کے تدبّر نے اپنی عیاریوں سے عربوں اور شامیوں کی کمک سے ترکوں کو اُن ممالک سے بیدخل کرنے کے بعد، نراج اور نفسی نفسی کا سُوَر راج قائم کیا تھا۔

غرضکہ اسلامی ممالک کا بظاہر کوئی مستقبل نہ تھا۔ مغرب کی سیاست نے مشرق کو ایسی زک دی تھی کہ صدیوں تک اُس کا اُبھرنا دوبھر نظر آتا تھا۔ اور "ہمہ اسلامی تحریک" اور مشرق کی بیداری کا خواب محض سراب معلوم ہونے لگا۔

اس زبردست جھٹکے نے اور اقوامِ عالم کو بھی ایک طرح سے پریشان کر رکھا تھا۔ تجارت اور بیوپار کی وہ گرم بازاری نہ رہی۔ عالمی کساد بازاری، بے روزگاری، افلاس اور فاقہ مستی کے مسائل نے دنیا کے مفکرین اور معاشیات کے ماہرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کیا۔ یہی مسائل ہندستان کے سامنے بھی تھے۔ موقع سے فائدہ اُٹھاکر ۱۹۲۱ء میں بڑی گرماگرمی کے ساتھ ترک موالات کی تحریک شروع ہوی۔ جسکی باگیں مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں آئیں۔ تھوڑی دیر

کے لئے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے اور ترکِ موالات اور خلافت کی تحریک ایک ساتھ چلنے لگی۔ علی برادران اور گاندھی جی کا سنجوگ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں خوب رنگ لایا۔ لیکن اکبر جیسے اہلِ نظر پہلے ہی تاڑ گئے تھے۔ کہ یہ دوستی دیر تک نبھنے والی نہیں۔ چنانچہ بعد میں جو واقعات درپیش ہوئے، اُن سے اکبر کی دور نگاہی زبان زدِ خاص و عام ہو گئی۔ ہر عارف و عامی کی زبان پر یہ شعر تھا۔ ؎

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اس آندھی پانی میں اقبال بیٹھے کیا کرتے تھے؟ بہتیروں کا خیال تھا کہ اقبال کی "حجازی لے" سرد ہو گئی لیکن اس موقعہ پر بھی وہ چُکے نہ تھے۔ بھلا وہ کب چوکنے والے تھے؟ الگ تھلگ بیٹھے ایک نہ ایک بات پتے کی کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے مسلمانانِ ہند کی جانب سے ترکوں اور خلیفۂ عثمانی کو آزاد کرنے کی اپیل کرے تو اقبال نے اس کوشش کی بیہودگی پر زہر خند اگلا۔ چند اشعار کی ایک مختصر سی نظم تھی لیکن بڑی

دور نگاہی کا پتہ دیتی تھی۔ عنوان تھا۔ "دریوزۂ خلافت"۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی؟
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن ابھی تک کوئی طویل نظم ایسی نہیں پیش کی گئی تھی جس سے جنگ عظیم کے اِن پریشان کن مسائل پر کافی روشنی پڑتی اور یہ معلوم ہو سکتا کہ اِن حالات میں اقبال کے پیشِ نظر کس قسم کے منصوبے تھے۔ آخر کار ۱۹۲۱ء کے آخر یا ۱۹۲۲ء کے شروع میں وہ نظم شائع ہوئی جو حقیقت میں اہم بامسمّیٰ ہے۔ ایک خضرِ طریقت کی طرح اپنی اس نظم "خضرِ راہ" میں اقبال نے اُن واقعات کا جائزہ لیا ہے جو اقوامِ عالم اور خصوصاً ایشیا والوں کی پریشانی کا باعث تھے۔ نظم کی ابتدا ایک گہرے تفکّر اور پُرسکون منظر سے ہوتی ہے۔ رات کا سناٹا ہے اور دریا کا کنارہ۔ زندگی کی چہل پہل چُپ چاپ ہے۔ دریا کی موجیں ایک ضدّی بچے کی طرح مچل کر پانی کی گہرائیوں میں سو گئی ہیں۔ جبکہ چاروں اُور (طرف)

یوں سکوت کا سُنسار چھایا ہے، تاروں کی چھاؤں میں خضر سے شاعر کی مُڈبھیڑ ہوتی ہے۔ شاعر اُس سے (خضر سے) کچھ سوالات کرتا ہے یہ وہی مسائل ہیں جو اوروں کی طرح اُسے بھی پریشان کر رہے ہیں خضر اِن سب کا امید افزا جواب دیتا ہے۔ اِن جوابات کے اُوٹ میں اقبال کا سارا رجائی فلسفہ تاک جھانک مچائے ہے۔:-

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اِک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما، خضر
جسکی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے: "اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب"

خضر کا اتنا سا اشارہ شاعر کے لئے ایک "سوال بند" بن جاتا ہے۔ وہ

(شاعر) خضر سے تابڑ توڑ کئی ایک سوال کرتا ہے۔ وہ سوالات کیا ہیں؟ سُنئے۔:-

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد؟
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں، اقوامِ نو دولت کے، ہیں پیرایہ پوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ،
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

اِن پریشان کُن مسائل کے جو جوابات خضر نے دیئے ہیں، اُن سے خود اقبال کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ہر عنوان کی ذیل میں کئی ایک اشعار ہیں جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہر سُرخی کے معنوی پہلو کو روشن کرتے ہیں اور ہر رنگ میں اقبال کی انوکھی اور بے نظیر رجائیت

بزاسوں کو آس دلاتی ہے۔ چاروں طرف مایوسی اور پریشانی کا عالم طاری ہے۔ بڑے بڑے سیانے حواس باختہ ہیں، مگر اقبال کے ماتھے پر نام کو شکن نہیں۔ پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفٰے کمال نے ترکوں کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ برطانوی فوجیں بُری طرح قسطنطنیہ سے کھسکیں۔ اب کیا تھا ایک دھوم مچ گئی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفٰے کمال پر پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی اُمید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں۔ طلوعِ اسلام اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ خوشی تا دیر رہنے والی نہ تھی، اس لئے کہ بعد میں کمال نے جو روش اختیار کی اُس سے اقبال کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور اقبال نے پھر کبھی اس طرف کو مڑ کر بھی نہ دیکھا گو ٹرکی اور ایران نے نئے سر سے جنم لیا۔ افغانستان نے بھی امان اللہ خاں کی قیادت میں آہستہ آہستہ رضا اور کمال کے نقشِ قدم پر چلنے کی ٹھان لی۔ "عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا"۔ لیکن اِن ممالک کی مغرب زدہ چالیں اقبال کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہیں۔ لہٰذا یہاں سے اپنے فلسفے کے اجتماعی پہلوؤں کو تج کر، اُنھوں نے خودی کی نوا کو تلخ کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ

"بیخودی" کی تان "خودی" کے شور نشور میں گم ہوگئی۔ یہاں سے مسلسل کئی سال تک اقبال کی نوا، عجمی (فارسی) ہی رہی۔ اور ۱۹۳۲ء یعنی جاوید نامے کے شائع ہونے تک اُردو زبان میں اقبال نے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ اُردو کی جگہ فارسی نے لی۔

اقبال کی فارسی کا شباب طلوعِ اسلام کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے۔ فلسفہ کی ٹھونس ٹھانس زیادہ ہے اور شعریت کم۔ پیامِ مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور نوشتی کا دَور ختم ہو جاتا ہے۔ اسرار و رموز کی شراب سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

پوری کتاب چار حصوں میں تقسیم ہوی ہے۔ شروع کے (۸۰) صفحوں میں قطعہ نما رباعیاں ہیں جن میں لطفِ زبان کے ساتھ، خودی کے وجد آفریں رموز بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصّے میں (جس کا عنوان ہے "افکار") مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ اِن نظموں میں کچھ عنوانات بانگ درا کی بعض نظموں کے عنوانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ (مثلاً افکار انجم۔ شبنم۔ لالہ۔ "بوئے گل"۔۔۔۔۔) لیکن یہاں ایک نئے انداز سے قدرت کے غوامض اور حُسن بے پایاں

پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصلِ بہار، کشمیر اور ساقی نامہ میں اقبال کا رنگین تخیل انتہائی زور کے ساتھ فارسی زبان میں پھول برسا رہا ہے۔ بعض نظمیں خیال کی ندرت، زبان کی گھلاوٹ، اور اسلوب کی جدت کے لحاظ سے فارسی ادب میں ایک انمول اضافہ ہیں۔ "ایران جدید" کے بعض شعرا نے جوشیلے اور ہمدرد بھرے گیت لکھے ہیں۔ اقبال کی نوائے وقت کو بھی پڑھئے جو ایرانِ جدید کے کئی ایک ترانوں پر بھاری ہے۔ پوری نظم ولولہ انگیز ہے۔ خوفِ طوالت مانع ہے۔ ورنہ یہاں نقل کرتا۔

حافظ کے ایک مشہور مصرعے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا (بدہ ساقی "مے باقی") تیسرے حصّہ کا عنوان ہے۔ حافظ کی مینا میں خودی کی شراب عجب بہار دکھاتی ہے۔ بعد کو یہ پری، رنگ چھان کر ایک نئے چھب سے زبورِ عجم میں نمودار ہوتی ہے۔

چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ہے "نقشِ فرنگ" جس میں مغرب کے بعض حکماء اور مشاہیر مثلاً نطشہ، برگساں، ہیگل، ٹالسٹائے، ہائنا، بائرن وغیرہ پر مزے کے تبصرے ہیں۔ پوری کتاب گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب ہے۔

پیامِ مشرق کے غالباً دو سال بعد زبورِ عجم شائع ہوی جس میں اقبال نے اپنا سارا فلسفۂ حیات راگ اور نغمے کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ فردوسی کو بھی دعویٰ تھا کہ اُس نے اپنی فارسی سے عجم کو زندہ کیا۔ مگر یہ دعویٰ قصّے کہانی اور رزمیہ افسانہ نگاری کی حد تک درست تھا۔ اقبال نے حقائق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا، اور صدیوں کی سوئی ہوی قوموں کو اپنے حیات پرور نغموں سے زندگی اور بیداری کا پیغام سُنایا ہے۔ یہ جاں فزا ترانے غزل کے دلکش سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ راگ اور رنگ مشرق کی جان ہے۔ اقبال اس راز کو خوب جانتے ہیں اور ایک ماہرِ نفسیات کی طرح، مریض کی نفسیات کو پہچان کر حافظ کی مینا میں خودی کی شراب چھلکائی ہے۔ نتیجہ اس کا خاطر خواہ ہوا۔ زبان کے چٹخاروں پر جان دینے والوں نے جن بے رس باتوں کو اسرار و رموز میں بہ جبر پڑھا تھا، اب زبورِ عجم کی مدبھری زبان میں انھیں مزے لے لے کر پڑھا۔

پوری کتاب چار حصّوں میں ہے۔ پہلا حصہ (۸۶ صفحوں پر مشتمل ہے، اور اس میں (۶۶) نغمے ہیں)۔ میں اِن کو نغمے ہی کہونگا اس لئے کہ گو اُن کا ظاہری روپ غزل کا ہے، مگر یہ غزلیں نہیں ہیں۔

اِن نغموں میں سے بعض کی بحریں اور ردیف و قوافی حافظ کی غزلوں کا کیف رکھتے ہیں، لیکن اِن میں مدہوشی نہیں۔ دو ایک نغمے مخمس، مثلث، اور ترکیب بند کی شکل میں بھی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ نغمے سب کے سب پڑھے جائیں۔ محض ایک اندازے کی خاطر چند اشعار یہاں پیش کرونگا۔ پہلا نغمہ ہی سنئے۔ دیکھئے لے غزل کی ہے مگر غزل نہیں:۔

فصلِ بہار، ایں چنیں، باغِ ہزار، ایں چنیں
چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار ایں چنیں

اشکِ چکیدہ ام ببیں، ہم بہ نگاہِ خود نگر
ریز بہ نیستانِ من، برق و شرار ایں چنیں

بادِ بہار را بگو، پے بہ خیالِ من بَرَد
وادی و دشت را دہد، نقش و نگار ایں چنیں

زادۂ باغ و راغ را، از نفسم طراوتے
در چمنِ تو زیستم با گل و خار ایں چنیں

عالمِ آب و خاک را، بر محکِ دلم بسائے
روشن و تابہ خویش را، گیر عیار ایں چنیں

دل بہ کسے نہ باختہ، با دو جہاں نساختہ
من بہ حضور می رسم، روزِ شمار ایں چنیں

ذرا اس دل کی بھی بہار دیکھئے۔ مگر یہ ہمارے ہاں کے عشاق کا دل نہیں۔ یہ دل ایک مردِ خود آگاہ کا دل ہے۔

بدہ آں دل کہ مستی ہائے اُو، از بادۂ خویش است
بگیر ایں دل کہ از خود رفتۂ بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل، بدہ آں دل، کہ گیتی را فسر اگیرد
بگیر ایں دل، بگیر ایں دل کہ در بندِ کم و بیش است
مرا اے صید گیر! از ترکشِ تقدیر بیروں کش
جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے، کہ در کیش است
نہ گردد زندگانی خستہ از کارِ جہاں گیری
جہانے در گرہ بستم، جہانِ دیگرے پیش است

ایک آخری مثال۔ شعر کیا ہیں سرودِ حیات۔ رمز اور اشارے میں کیسے پتے کی باتیں کہہ دی ہیں:—

چند بروئے خود کشی، پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا، تمام کن، جلوۂ ناتمام را
من بہ سرودِ زندگی، آتشِ او فسردہ ام
تو نمِ شبنمے بدہ، لالۂ تشنہ کام را
عقل، ورق ورق بہ گشت، عشق بہ نکتہ رسید
طائرِ زیر کے بَبُرد، دانۂ زیرِ دام را
نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را
وقت برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا بَرم ہم نفسانِ خام را؟

دوسرا حصہ پہلے حصے سے کچھ کم جاذب توجہ نہیں۔ اس حصے کی منظوم سُرخی ہی وہ معنویت رکھتی ہے کہ اُس میں اقبال کا سارا فلسفہ سمٹ سمٹا کر بیت الغزل بن گیا ہے۔ شعر ہے۔

شاخِ نہالِ سدرۂ، خار و خس چمن مشو
منکرِ اُو اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

اقبال خودی کا یہ پرچار بار بار کیوں کرتے ہیں؟ اس کا سبب

کچھ انھیں کے مدبھرے الفاظ سے سنیئے۔

چو موج، مستِ خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بہ داماں کش؟
بہ قصدِ صیدِ پلنگ، از چمن سرا برخیز!
بہ کوہ رخت کشا، خیمہ در بیاباں کش
بہ مہر و ماہ کمندِ گلوفشار، انداز
ستارہ را زِ فلک گیر و در گریباں کش
گرفتم ایں کہ شرابِ خودی بسے تلخ است
بہ دردِ خویش نگر، زہر را بہ درماں کش

اس آتما ترنگ کی چند تانوں پر قناعت کیجئے۔ تناسب کا احساس مجھے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ پوری زبور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس حصّے کے صرف ایک نغمے کو یہاں جگہ دی گئی ہے۔ پڑھنے والے کے ذوقِ خودی کو بیدار کرنے، اور اُس کے خون میں گرمی پیدا کرنے کے لئے ایسے (۷۴) نغمے اور ہیں۔ البتہ حصّہ اول و دوم کے ترجیع بند (۱۹، ۱۸، ۱۹ اور ۳۰) بڑے

جوشیلے اور اثر آفریں نغمے یا ترانے ہیں، جنھیں جوش (ملیح آبادی) نے تھوڑے سے تغیر کے بعد اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اِن ترانوں کے ترجیعی مصرعوں کے ٹکڑے ہیں:- (۱) "انقلاب اے انقلاب" اور (۲) "از خوابِ گراں خیز"۔

تیسرے حصّے کا عنوان ہے گلشنِ راز جدید۔ جس میں نو منظوم سوالوں کے بطرزِ مثنوی مفصل جوابات دئے گئے ہیں۔ یہ سوال اور اُن کے جوابات، چند فلسفیانہ موشگافیوں سے متعلق ہیں جو عام دلچسپی کا سامان نہیں رکھتے۔ چوتھے حصّے کا عنوان ہے بندگی نامہ، جس میں بعض فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوّری پر اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جو بعض کے نزدیک درست اور بہتوں کے نزدیک بحث و نزاع کا موضوع ہیں۔ لیکن ہر جگہ شاعر کی جادو بیانی پڑھنے والوں کی زبان بندی کر دیتی ہے۔ ہے یہ کہ پہلے دو حصّے زبورِ عجم کی جان ہیں۔

زبورِ عجم کی اشاعت کے دو ایک سال بعد ہی اقبال نے اپنی اُس لازوال تصنیف کے تانے بانے درست کرنے شروع کئے جس نے اقبال کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس سے میری مُراد ہے جاوید نامہ

جو اقبال کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ اور اُس کی زندگی کا حاصل ہے۔ اب تک جو کچھ اقبال نے کہا اور کسی سطح سے کہا تھا۔ لیکن یہاں جو کچھ کہا گیا ہے، ایسے بلند مقام سے کہا ہے جہاں الہام اور شعر، اور عرفان اور ادبیات عالیہ کی حدیں ملتی ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است ایں کتاب از آسمانے دیگر است

آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ "فنکار کا عمل، اُس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے" جاوید نامہ اقبال کی یگانہ سرشت کا وہ بے مثل ثمر ہے جسکی مثال خود اقبال کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلسل تین سال تک اس کتاب کی تخلیق میں اقبال نے اپنی توانائی بے دریغ صرف کی۔ جب کہیں یہ انمول رتن عدم سے وجود میں آیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جبکہ اقبال مدراس اور بنگلور میں اپنے خطبات سُنا کہ حیدرآباد آئے تھے، اُس زمانے میں اس کتاب کے کچھ دُھندلے نقوش اُن کے ذہن میں تھے۔ اس موقع پر جب میں نے اُن کو دیکھا تو ایک خاص تفکر اور پریشانی کے آثار اُن کے چہرے سے نمایاں تھے۔ یہ وہ آثار تھے جو کسی شاہکار کی تخلیق سے پہلے کسی فن کار کے چہرے سے "غم پنہاں" کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کچھ ضرورت سے

زیادہ فکرمند اور کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی انتہائی سوچ میں کسی چیز کی تلاش یا دُھن میں ہو۔ بعینہٖ وہ دُھن اور فکرمندی جو کسی اعلیٰ التخلیق کاری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس انوکھی فکرمندی کا گُل اُس وقت کھلا جب ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شایع ہوا۔

ملٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کی "گم شدہ فردوس" اُس کی تمام زندگانی کا حاصل اور اُس کے شاعرانہ کمال کا نچوڑ ہے۔ اپنی ساری توانائی اُس نے اِس کتاب پر صرف کردی جب کہیں اس لازوال کتاب کے نقوش اُس کے امرت بھرے قلم سے نغمے اور شعر کے پیکر میں ظاہر ہوئے۔ بعد کو اور بھی چیزیں اُس کے قلم سے نکلیں۔ لیکن یہ بات کسی میں نہ آئی۔ یہ مثل اقبال کے جاوید نامہ پر بھی صادق آتی ہے، جس کی تیاری میں اُس نے اپنا خونِ حیات پانی کی طرح بہادیا۔ بعد کو دو مجموعے اُردو کے اور ایک مجموعہ فارسی کا بھی نکلا۔ اُردو کے پرستاروں کی جان میں جان آئی کہ اقبال نے پھر اُردو کی طرف توجہ کی۔ لیکن میری رائے میں یہ دونوں کتابیں ایک تھکے ہوئے نقش کار کے وہ نقوش ہیں، جو اُس نے بائیں ہاتھ سے گھسیٹے ہیں۔ مانا کہ اِن نقوش میں وہ کمال ہے جو بہتیرے باکمالوں کے داہنے ہاتھ کی تخلیق کاریوں میں نہیں۔ پھر بھی

جاوید نامے کے آگے ضربِ کلیم اور بالِ جبریل گھٹیا درجے کی چیزیں ہیں۔ میرے کہے کا یقین نہ ہو تو کم سے کم ایک ایسے شخص کے الفاظ سُنئے جو مشرقی علوم کی گود میں پلا ہے۔ مولانا اسلم جیراج پوری جاوید نامے کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں: "ہم سُنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی، مولانا روم، گلستانِ سعدی، اور دیوانِ حافظ۔ لیکن اب جاوید نامے کو پانچویں کتاب سمجھنی چاہیئے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے اِن سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانے میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائیگی۔"

شکر کا مقام ہے کہ یہ کتاب نصاب میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی اُس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگ شوق سے اپنے طور پر اُس کو پڑھیں۔ جبراً پڑھانے اور شاملِ نصاب کرنے میں ایک شاہکار کا حُسن ارا جاتا ہے اور وہی مثل صادق آتی ہے کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد؟"

ایک بلند پایہ تصنیف کی حیثیت سے یہ کتاب یوں بھی تفصیلی تنقید سے بے نیاز ہے۔ میں خود بھی اُس جوشِ تنقید اور زور

ہمہ دانی کو بُرا سمجھتا ہوں جبکہ ایک بزعم خود غلط تنقید نگار کسی اچھی کتاب کا سب رس نکالنے کی کوشش میں، اُسے بے رس بنا دیتا ہے۔ آرٹ وہی ہے جو تنقید اور تعریف کی حدوں میں نہ آئے۔ اس لئے میں صرف ایسے امور پر اکتفا کرونگا جن سے اس کتاب کو اپنے طور پر پڑھ کر محظوظ ہونے میں آپ کو آسانی ہو۔

ساری کتاب رنگین تخیل، شاعرانہ پروازِ نظر، اور فلسفیانہ بلند نگاہی کے ساتھ ادبی اور فن کارانہ لطافتوں سے مالا مال ہے۔ زبان میں پختگی کے علاوہ بلا کی مٹھاس ہے۔ کتاب کا سارا ہیرنگ مثنوی میں ہے، لیکن جا بجا پُر کیف نغمے بھی غزل کے سانچے میں پیش کئے گئے ہیں، جن میں بلا کا ترنم اور شعریت ہے۔ اِن میں سے بعض نغمے تو وہی ہیں جو زبور عجم سے لے کر یہاں پر مناسب موقع شامل کر دئے گئے ہیں۔ غزلوں کا یہ جڑاؤ کام عجب بہار دکھاتا ہے۔

کتاب کے شروع میں شاعر کا منظوم دیباچہ ہے جس سے اس نظمِ جاوید کا معنوی پہلو چار مصرعوں میں آئینہ ہو جاتا ہے:-

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بودہ است ۔۔۔ بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بودہ است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست ۔۔۔ کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بودہ است

شکوہ اور جواب شکوہ میں بھی اقبال ہنگامۂ زمیں سے دور، آسمانوں کے اُس پار گئے تھے۔ لیکن یہ اُس وقت کا ذکر ہے جبکہ یہ فنکارانہ بلندی اُنھیں نصیب نہ ہوی تھی۔ صرف زبانی جمع خرچ تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی زمین سے اُبھارتا ہو۔ لیکن اس مرتبہ وہ پورے اہتمام اور فن کارانہ تفصیل کے ساتھ مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں، اور اس طرح نوبت بہ نوبت اور منزل بہ منزل فرازِ آسماں کا رُخ کرتے ہیں اور اپنے عرفانی مدارج کا ہر زینہ الفاظ کے نقوش سے اس طرح روشن کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی ساتھ ہی ساتھ اِس نئی دنیا کو دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس اِجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو دیباچے کے علاوہ "مناجات" (جس سے کتاب دراصل شروع ہوتی ہے) تمہید آسمانی اور تمہید زمینی کو بغور پڑھیے جن کے ذریعے شاعر نے مختلف دل پذیر طریقوں سے واقعیت کا طلسم باندھا ہے۔ مُناجات کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ اِس "جہانِ ہفت رنگ" میں انسان کو سدا درد آشنا رفیق کی تلاش رہتی ہے کہ اُس سے اپنے دل کا ماجرا بیان کرے۔

لیکن وہ ناکام ہی رہتا ہے، اِس لیئے کہ اِن مٹی کے پُتلوں سے دِل جوئی کی امید رکھنا ہی عبث ہے۔ خصوصاً اس دوُر میں کہ انسان دُور بیں ہے مگر بصیرت نہیں رکھتا۔

غرضکہ نہایت دل آویز طریقوں اور نازک تشبیہوں اور اشاروں سے بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شاعر کے اثر میں ڈوبے ہوے الفاظ کی پذیرائی کا پڑھنے والے کو بھی یقین سا ہونے لگتا ہے۔ اِس کے بعد تمہید آسمانی میں زمین کی بے رونقی پر آسمان کا زہر اُگلنا، جنابِ باری میں زمین کی درد بھری فریاد اور رحمتِ باری کا جوش میں آکر خاکدانِ ہستی کو بھاگوان اور نہال کرنے کا وعدہ، اور پھر ندائے غیبی کے بعد نغمۂ ملائک کی امید افزا بشارت، یہ سب چیزیں اس کمال اور فن کارانہ اہتمام کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جبکہ اقبال کو وہ معراجِ عرفان حاصل ہو جائے جس کے وہ آرزومند ہیں۔ نغمۂ ملائک کے اشعار یہاں پیش کرتا ہوں دیکھیئے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد اُن کی یہ بہار ہے تو اپنی جگہ پر کیا عالم ہو گا؟ سارے اشعار ترنم اور رجائیت میں شرابور ہیں:۔

فروغِ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ اُو افزوں شود روزے
خیالِ اُو کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
زگردابِ سپہرِ نیلگوں، افزوں شود روزے
یکے در معنیٔ آدم بنگر، از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد، موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ اُو، پُرخوں شود روزے

(تمہیدِ آسمانی۔ جاوید نامہ)

نغمۂ ملائک ابھی کانوں میں گونجتا ہی رہتا ہے کہ شام کے شعریت سے لبریز سناٹے میں شاعر، مولانا روم کی ایک مستانہ غزل دریا کے کنارے گنگناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اشعار کے الفاظ بھی بڑے برمحل اور ذو معنی ہیں۔ ان پہلو دار الفاظ اور تشبیہوں کی آڑ میں ایک جگہ اقبال نے (رومی کی زبان میں) اپنے زمانے کے "دیو و دَد" اور اُن کی فرعونیت پر پیمبرانہ لہجے میں برہمی کا اظہار کیا ہے۔ یہ چیز ضربِ کلیم میں اور بھی نمایاں ہو گئی ہے، جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔

چند اشعار تمہید زمینی کے پیش کرتا ہوں۔ ضربِ کلیم کا حوالہ بطور جملۂ معترضہ کے تھا:-

بگشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست
بنمائے رُخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار
رقص چنیں، میانۂ میدانم آرزوست
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلمِ اُو
آں نورِ جیبِ موسیٔ عمرانم آرزوست
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

(تمہید زمیں۔ جاوید نامہ)

شعر خوانی کا سلسلہ ختم ہونے پر، شعریت اور سکون سے اِس لبریز ماحول میں دریا کے کنارے کچھ دُور ایک پیکرِ نور، پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ وہی "خضرِ طریقت" ہے

جس کے غائبانہ فیض نے اقبال سے اسرار و رموز لکھوائے تھے۔
یہاں سے بے محابہ سوالوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے اور پیر رومؔ
اقبال کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔ پھر معراج کے
اسرار سے باخبر کرتے ہیں۔ معراج کیا ہے؟ شعورِ کامل جس کے تین مدارج
ہیں۔ (۱) شعورِ ذات۔ (۲) شعورِ غیر۔ (۳) شعورِ حق تعالیٰ۔ اِس اجمال
کی تفصیل یہ ہے:۔

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش
امتحانِ خویش کن موجودہ باش

تو ازیں نُہ آسماں ترسی؟ مترس
از فراخائے جہاں ترسی؟ مترس
چشم بکشا، بر زمان و بر مکاں

ایں دو یک حال است بر احوال جاں
چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقام چار سو خو کردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق
ایں بدن از جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

رومی کے ان الفاظ سے شاعر اپنے میں ایک غیر معمولی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں اور رومی کی معیت میں شاعر عالم علوی کی سیر کرتا ہے جہاں زرواں (روح زمان و مکان) سے اُس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رہا سہا حجاب بھی دور ہو جاتا ہے۔ زرواں کی نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ شاعر خود کو عالم افلاک کی

طرف اُڑتا ہوا پاتا ہے۔ یہ کیفیت کیسے طاری ہوئی؟ اس کا لُطف کچھ شاعر ہی کی زبان سے آئیگا۔

درنگاہِ اُو نمی دانم چہ بود
از نگاہم این کہن عالم رَبود
یا نگاہم بردِ گر عالم کشود
یا دگرگوں شد ہمیں عالم کہ بود
مُردم اندر کائناتِ رنگ و بُو
زادم اندر عالمِ بے ہائے و ہو
تن سُبک تر گشت و جاں سیّار تر
چشمِ دل بینندہ و بیدار تر

اب کیا تھا بے پَر کے اُڑنے لگے۔ مختلف سیّاروں کی خبر لی۔ پہلے قمر فلک پر پہونچے اور اس کے بعد دوسرے سیّاروں کا جائزہ لیا۔ ہر جگہ اقبال کے جبریل ہیں ساتھ ہیں۔ اب یہاں سے اپنے طور پر معراجِ اقبال کا کمال دیکھئے۔ آگے کیا بیان کیجئے کہ تقید کے پَر جلتے ہیں۔ مزہ جب ہی ہے کہ نشانِ منزل تھوڑا بہت بتانے کے

بعد پڑھنے والا خود پڑھے اگر صحیح لطف اٹھانا چاہتا ہے۔

کتاب کے خاتمے پر بطور ضمیمہ کچھ اشعار ہیں جن میں اقبال کے فرزند جاوید سے خطاب ہے۔ اصل میں یہ خطاب ساری نئی پود سے ہے۔ نوجوانوں ہی سے اقبال کو بجا طور پر امیدیں ہیں۔ بڈھے تو بے رُت کے پھل ہیں ؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن دارم از روزے کہ می آید سخن!
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

(مناجات - جاوید نامہ)

وہی "تنگنائے غزل" جس کے غالب کبھی شاکی تھے، اقبال نے اب اُس میں "بقدر شوق" وسعت پیدا کرلی ہے اور اُس کے اندر سارا فلسفۂ خودی اور حالات حاضرہ سے متعلق اقبال کے تمام تاثرات موجیں مارتے ہیں، گویا "سمندر ہے اک بوند پانی میں بند"۔ اس شاعرانہ اعجاز کا نمونہ وہ کتاب ہے جو جاوید نامے کی اشاعت سے تین سال بعد (۱۹۳۵ء) بالِ جبریل کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کتاب کا نصف سے زاید حصّہ زبور کا چربہ ہے۔ اور وہی باتیں بہ الفاظ دیگر دہرائی گئی ہیں۔ خبر نہیں اس کا نام اقبال نے بالِ جبریل

کیوں رکھا۔ زبورِ ہند بہتر نام ہوتا۔ ممکن ہے کہ جاوید نامے میں سیرِ افلاک کرنے کے بعد بھی اُس دُنیا کے طلسمی مناظر دماغ میں گھوم رہے تھے جس کی بنا پر اقبال نے غالباً اس نام کو زیادہ موزوں پایا۔

جن پر فارسی کے دروازے بند ہوں اُنھیں بالِ جبریل پر قناعت کرنی چاہیئے۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، اور جاوید نامے پر انتہائی زور اور شاعرانہ توانائی صرف کرنے کے بعد اقبال نے اُردو کا رُخ کیا۔ گو وہ تنوع جو پیامِ مشرق میں ہے، یا وہ تغزل اور برجستگی جو زبور میں ہے، یا وہ فن کارانہ اہتمام اور وہ بیداریٔ تخیل جو جاوید نامے میں ہے، اِس کتاب میں نہیں۔ تاہم ایک بیکراں دماغ کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے بیکراں چیز ہے اور محض اُردو داں حضرات کے لئے جو فارسی کے "نقشہائے رنگ رنگ" سے بے بہرہ ہیں، بالِ جبریل، زبورِ عجم اور جاوید نامے کا بدل ہے۔ کتاب کا بیشتر حصّہ زبور کے ابدی نغموں کی صدائے بازگشت ہے۔ جس طرح زبور میں شراب خودی حافظ کی مینا میں پیش کی گئی تھی، بالِ جبریل میں وہی شراب داغ اور غالب کے گنگا جمنی ساغر میں چھلکائی گئی ہے۔ بظاہر وہی کیفِ شیراز اِن غزل نما نغموں میں بھی دکھائی دیتا ہے

لیکن یہ کچھ اور چیز بلکہ اقبال کی اپنی چیز ہے۔ فارسی سے برسوں شغف رہنے کے باعث، زبان بانگ درا سے بہتر اور منجھی ہوئی ہے۔ اسلوب میں پختگی ہے اور بندشیں چست ہیں۔ مگر کہیں کہیں فارسی کی نامانوس ترکیبیں بھی آگئی ہیں۔

دوسرا حصّہ مختلف موضوعوں پر مشتمل ہے۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارتوں اور مقامات پر ہیں جن سے ہر مسلمان کے جذبات اب تک وابستہ ہیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اقبال جب یورپ گئے تھے تو ہسپانیہ کے اُن شہروں کا جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و شائستگی کا گہوارہ تھے، بھی طور پر دورہ کیا تھا۔ مسجد قرطبہ اور دوسرے عنوانوں کی نظمیں جو ہسپانیہ سے متعلق ہیں انھیں تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ایک نظم جس کا عنوان ہے "ذوق و شوق" فلسطین میں لکھی گئی تھی۔ خاصی اچھی اور پُر ترنم نظم ہے اور ابتدا میں مناظر قدرت کی مُوکشی اقبال کے حُسن کار از کمال کا پتہ دیتی ہے، جس کے بیشتر نمونے بانگ درا میں بھی جا بجا موجود ہیں۔ اِن نظموں کے علاوہ اور بھی چھوٹی بڑی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں، لیکن ساقی نامہ بہترین نظم ہے۔ بہار کا منظر اور قدرت کے منوہر بیل بوٹے بڑی

چابک دستی سے کھینچے گئے ہیں۔ بعد کے بندوں میں حالات حاضرہ کے بعض اہم مسائل پر کوثر کی دُھلی ہوئی زبان میں تبصرے ہیں۔ پوری نظم مثنوئ سحر البیان کے طرز پر اور اُسی بحر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اقبال کا سحر بیان کچھ اور ہے۔ جن کی نظریں محض لطفِ زبان پر ہوں اُنھیں اتنا دھوکا ضرور ہوگا کہ اقبال کے پیکر میں میر حسن نے جنم تو نہیں لیا؟ یہ چند اشعار دیکھئے۔ دورِ حاضر کے خشک اور اُلجھے ہوئے مسائل کو لیا ہے، لیکن کتنی سُلجھی ہوئی زبان اور نکھری تشبیہوں میں بیان کیا ہے۔ شروع میں رسمی طور پر ساقی سے خطاب ہے۔ مگر یہ ساقی کوہ فاراں کا ساقی ہے:۔

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے، بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا..... — تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
دلِ طورِ سینا و فاراں دونیم — تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم

متاعِ اقبال

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

شرابِ کُہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پَر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری!
اُمیدیں مری، جستجوئیں مری!
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات!
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے!
لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

(ساقی نامہ۔ بالِ جبریل)

ایک سال کے اندر باہر ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) بھی شائع ہوئی

جس میں دورِ حاضر کی فرعونیت کے خلاف کھلا "الٹی میٹم" (اعلانِ جنگ) ہے۔ کتاب کا عنوان وجہ تسمیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں سے اقبال کی نوا میں زوال کے آثار صاف نمایاں ہیں۔ یہی حال "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا بھی ہے۔ ہر کمالے را زوالے۔ آخر کہاں تک انسانی دماغ کام کرتا؟ دانتے کے بارے میں مشہور ہے کہ "آسمانی طربیہ" کے لازوال نغموں کے بعد اُس کی صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ یہی حال اقبال کا ہوا۔ جاوید نامے نے انھیں زندۂ جاوید کیا اور مارا بھی۔ دنیا کے اور صاحب کمالوں کی طرح وہ سخت جان تھے۔ استقلال اور ہمت نے جاوید نامے کے جان لیوا بار کے باوجود بالِ جبریل کے اوراق اُن سے مرتب کرائے۔ لیکن بالِ جبریل کی اشاعت اُن کے حق میں موت کا پیش خیمہ تھی۔ کوئی تین سال اور جیئے لیکن کس طرح کہ دل اور دَمے کی شکایت سے اُن کی جان ضیق میں تھی۔ اس پر بھی دو کتابیں لکھ ہی ڈالیں۔ دونوں (ضربِ کلیم اور پس چہ باید کرد....) کتابوں میں اقبال ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو گولی کھا کر بھی اپنے دشمن پر جست کرتا ہو، موجودہ دور کی ناانصافیوں کے خلاف گرج رہے ہیں۔ دونوں کتابوں کا لہجہ وہ جلالی شان رکھتا ہے

جیسے بنی اسرائیل کا کوئی نبی اپنی گمراہ قوم کو راہِ راست پر لانے کے لئے کڑک رہا ہو۔ کلام میں مذہبیت زیادہ ہے اور شعریت کم۔ جہاں وعظ ہو وہاں شعریت کیسی؟

گاندھی اور اقبال کے بارے میں اختلاف رہا ہے اور رہیگا۔ یہی دونوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ دونوں ہندستان کے ایسے سپوت ہیں کہ ملک انھیں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ دونوں نے اِس مُلک کی ذہنی اور سیاسی بیداری میں ایسا انقلاب برپا کیا ہے کہ جسکی نظیر ہندستان کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ اقبال ایک بڑا انسان ہے اس لئے کہ وہ ایک بڑا شاعر تھا اور اُس کا پیغام ہند سے گزر کر ایک عالمگیر اپیل رکھتا ہے۔ اُس کا نام تاریخ کے اوراق میں سدا جگمگاتا اور سینوں اور دلوں میں جگنو کی طرح چمکتا رہے گا۔ وہ چل بسا مگر اُس کا پیام اٹل ہے۔ ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم ؟
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں ؟
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دِن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

(۳)

اقبال کا شاعرانہ افلسفہ

(مئی سنہ ۱۹۳۸ء)

اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ اسی میں اُسکی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ فلسفے اور شعر کا جہاں خوشگوار امتزاج ہو، شعر جادو بن جاتا ہے۔ اقبال سے پہلے یہ سعادت مرزا غالب کو نصیب تھی، جو اپنی اِس انوکھی شانِ کج کلاہی کی بدولت اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہے۔ غالب کی شعریت فلسفے پر سدا غالب رہی۔ لیکن اقبال کی فلسفیت بعض اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے، اور بہ حیثیت شاعر یہی اُسکی کمزوری ہے۔ جب تک وہ (اقبال) اپنی انوکھی مذہبیت اور "ہمہ اسلامیت" کا دل دادہ نہ ہوا تھا، اُس کا کلام مقبول خاص و عام رہا۔

گو ابتدا میں اقبال نے داغ سے رشتۂ شاگردی جوڑا تھا لیکن ذہنی اور روحانی حیثیت سے وہ غالب کا پرستار اور غالب کے کلام کا خوشہ چیں تھا۔ غالب کا اثر (چند غزلوں کو چھوڑ کر جو داغ کے

رنگ میں ہیں) انکی ابتدائی کوششوں میں صاف جھلکتا ہے۔ میں شاعر کی ایک نظم کے کچھ اشعار پیش کرونگا جو کسی خاص مصلحت کی بنا پر "بانگ درا" میں شامل نہیں کی گئی۔ نظم کا عنوان ہے "نالۂ یتیم" جو ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ الفاظ، بندشیں، ترکیبیں، اضافتیں، سب پر غالب کا اور خصوصاً غالب کے کلام کا ابتدائی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

آمدِ بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم ہو نہ مرہونِ سماعت جسکی آوازِ قدم
لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دم یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم
رنگ کچھ شہرِ خموشاں پر جما سکتی نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

اسی نظم کا آخری بند، سلاستِ زبان اور خاطر نشین اندازِ بیان کا تنہا نمونہ ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ شاعر عجب نہیں کہ اپنے روحانی استاد کی طرح آگے چل کر سلاست اور نغمے کے دریا بہا دے۔ اس کے علاوہ اس نظم کے آخری بند کے اشعار اس امر کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ یہ کاشمیری الاصل برہمن زادہ، ممکن ہے کہ ہندی قومیت اور ہمالہ کی عظمت کے ترانے

اور نئے شوالے کی من موہنی فضاء کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں "حجازی لے" کا دل دادہ نہ ہو جائے۔ یہ ہو کر رہا، اور اسی بنا پر بعض قوم پرست ہندیوں اور اُردو ادب کے پرستاروں کو اقبال سے اُسکے جیتے جی دُھری شکایتیں رہیں۔ ایک تو یہ کہ اُنھوں نے اپنا قدیم ہندی مسلک ("ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا") کیوں چھوڑ دیا؟ اور پھر یہ کہ اُردو کو تج کر ایران کی جانب انتقال ذہنی کیوں کیا؟ دوسرا سوال میرے نزدیک خارج از بحث ہے۔ البتہ پہلا سوال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے اور اس کا اجمالی جواب اس مختصر باب کا موضوع بحث ہے۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں تمام ہندستان قومیت اور ہوم رول کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی زمانے اور اسی فضاء میں اقبال نے اپنی شعری استعداد اور خداداد ذہانت کا پورے طور پر احساس کیا۔ کوئی شاعر اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے الگ تھلگ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے، اُسے اپنی سرشت کے حساس سانچے میں ڈھال کر ایک خوبصورت اور دل کش انداز میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کا ہندی ترانہ، میرا وطن وہی ہے، نیا شوالہ اور تصویر درد، انھیں تاثرات کا

نتیجہ ہیں۔ ان نظموں کے بیشتر اشعار اسقدر زبان زدِ خاص و عام ہیں کہ اُن کا یہاں دُھرانا کوئی تُک نہیں رکھتا۔ غرضکہ تمام ہندستان اقبال کی والہانہ تان اور ترانے سے گونج اُٹھا۔ اور اہلِ مُلک نے بلا امتیاز مذہب و ملت، اس نوجوان قومی شاعر کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔

اپنی شہرت کا سکہ بٹھا کر ۱۹۰۵ء میں اقبال نے دیارِ مغرب کا رُخ کیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے زمانے میں اُنھوں نے فارسی ادبیات، اسلامیات، فلسفے اور خصوصاً فلسفۂ قدیم کا گہرا مطالعہ کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن اور وضع معاشرت سے اُنھیں ایک بدظنی اور نفرت ہوگئی۔ چنانچہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں جو اشعار اقبال نے اپنے دوست (سر) عبدالقادر کے رسالے کے لئے بھیجے تھے، اُن سے شاعر کے بدلتے ہوئے رُجحان کا پتہ لگتا ہے۔

جیسے جیسے اِس تنفر میں اضافہ ہوتا گیا، وہ رسولِ عربیؐ کی سیدھی اور پُر جوش تعلیم کے گرویدہ ہوتے گئے۔ اور بہ حیثیت فلسفی اُنھوں نے اسلام کے اُصولوں کو نظر کے سامنے رکھکر، عالمگیر اخوت اور حیات افراد کی ترقی اور تعمیر کا وہ انوکھا بیرنگ تیار کیا جسکو نہ تو نطشے اور نہ برگساں کے فلسفے سے براہِ راست کوئی تعلق ہے، جیسا کہ اقبال کے بعض یورپی

ناقدوں نے دھڑلے کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو خود اقبال نے اپنے ایک خط کے ذریعہ (جو ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھا گیا تھا) دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ اس خط کے شاعر کی فارسی اور اردو تصانیف میں بھی جا بجا فلاسفۂ مغرب کی تعلیمات سے بیزاری اور کم اعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار جو "ضرب کلیم" سے لئے گئے ہیں:-

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا گہر صدف سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی — کس طرح خودی ہو لازمانی
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری

ایک نظم (علم و عشق) کے دو بند اور دیکھئے:-

علم نے مجھ سے کہا — عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا — علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن — کرم کتابی نہ بن

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تمنائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!

بہرحال کچھ اس قسم کے خیالات اور احساسات لے کر ۱۹۰۸ء میں اقبال ہندستان آئے۔ اہل ملک کی آس بندھی کہ اقبال کے مُنہ سے وہی اگلی تان (ہندوستاں ہمارا) نکلے گی۔ لیکن یہاں مضمون ہی کچھ اور تھا۔ بہتوں کو مایوسی ہوئی۔ لیکن اقبال نے پروا نہ کی اور کچھ دنوں "سارا جہاں ہمارا" اور شکوہ وغیرہ سُنا کر فارسی زبان میں اپنا انوکھا دستور العمل مرتب کرنا شروع کیا۔ یہ ایک شاعرانہ خواب تھا جو اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اوراق میں "مستور بھی عریاں بھی ہے"۔

یہ دونوں مثنویاں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ لیکن اُردو سے شاعر نے ابھی پورے طور پر عدم تعاون

نہیں کیا تھا۔ اور اُسکے انوکھے شاعرانہ فلسفیانہ دستورالعمل کے شائع ہونے سے کچھ پہلے اور بعد تک بھی چند اُردو نظمیں چھپتی رہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں جنگِ بلقان کے تاثرات اور عالم اسلام کے اضطراب اور بے چینی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔ یہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کم از کم مسلمانوں نے "ہندی ترانے" سے زیادہ اِن نظموں کو سراہا۔ مؤخر الذکر نظم میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کی جھلک بھی بعض مقامات پر صاف نظر آتی ہے:-

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا — غیر یک بانگِ درا، کچھ نہیں ساماں تیرا

"پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا" کا نعرہ ایک ایسا دھکا تھا جس کے بعد قوم پرستوں کو اقبال کی جانب سے مایوسی ہوگئی اور گو بہ حیثیت شاعر اقبال کی عظمت کے اُسکے کٹر مخالفین بھی معترف رہے، تاہم اقبال کی

ہمہ اسلامی (پان اسلامی) تحریک ایک مجذوب کی بڑ سمجھی جانے لگی مگر شاعر اپنی دُھن کا پکا تھا۔ اُس نے آخر کار اپنا منظوم دستور العمل (جسکی شیرازہ بندی میں اُس کا شاعرانہ دماغ کئی سال سے مصروف تھا) اہل ملک اور ہندستان کے باہر رہنے والے مسلمانوں کی رہنمائی اور ہدایت کی خاطر پیش کر ہی دیا اور "شمع و شاعر" لکھنے کے بعد کئی سال تک اُردو کا رُخ نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شمع و شاعر اقبال کا بہترین کارنامہ ہے جس میں فلسفے اور شاعری کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ اگر اس کا سارا اُردو کلام تلف بھی ہو جائے تو اُسکی عظمت کے منوانے کے لئے یہ ایک نظم کافی ہے۔ یہ نظم شاعر کی شاعرانہ سحر کاری، فلسفیانہ پروازِ نظر، جوشِ عمل، اور انوکھی رجائیت کا نچوڑ ہے۔ انتخاب میں وہ بات کہاں؟ پھر بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:-

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو، ہوا

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کا شاعرانہ فلسفہ

وائے ناکامی کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا، اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرہ
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائیگی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی، رنگیں قبا ہو جائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

برطانوی سامراج کے کارندے آخری دو بندوں کے اشعار کا پورے طور پر مطلب سمجھ لیتے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتے!

شمع و شاعر اور اسرار و رموز کی اشاعت کے بعد چند ایک سال تک اقبال نے اور کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خاموشی بے سبب نہ تھی، اس لئے کہ جنگِ عظیم نے اقوامِ عالم کو بدحواس اور پریشان کرنے کے علاوہ، خود اقبال کے قصرِ امل کی بنیادیں ہلادی تھیں۔ اتحادیوں کے ہاتھ میں ترکی کی جان کے لالے پڑے تھے اور شاعر کا ہمہ اسلامی خواب یک لخت زائل ہوتا نظر آتا تھا۔ لیکن اقبال شاعر تھا، اور بہ حیثیت ایک شاعر کے اسے کسی

نہ کسی طرح، اپنے شاعرانہ وجود سے اوروں کو محظوظ کرنا اور اپنے وجود کا ثبوت دینا لازم تھا۔ لہٰذا اُس نے عالمگیر اخوت اور خلافت کی بجائے فلسفے اور تغزّل میں پناہ لی۔ چنانچہ پیامِ مشرق اور دوسری فارسی تصانیف اسی گریز کا نتیجہ ہیں، جہاں شعر و نغمہ اور محض فلسفیانہ پروازِ نظر کے سوا کوئی تعمیری، یا کام کا فلسفہ نظر نہیں آتا۔

جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد عالمی کساد بازاری، تجارتی پستی، اور بے روزگاری کے مسائل نے اہلِ بصیرت کو اشتراکی زاویۂ نگاہ اختیار کرنے پر مجبور کیا یہ ہی مسائل ہندوستان کے سامنے بھی تھے۔ مگر اقبال نے وطنی مسائل کی چوحدی سے گزر کر، سیاستِ عالم کے دُور رس پہلوؤں اور اقوامِ مشرق کی زبوں حالی اور ابتری پر نظر دوڑائی ہے۔ اور پھر مغربی اقوام کی عیارانہ سیاست پر بے پناہ حملے کئے ہیں۔ ان تاثرات کی جھلک آپ کو اُس نظم میں ملے گی جو غالباً ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کا عنوان ہے "خضرِ راہ" پوری نظم پر تفکر اور اُداسی کی ایک ہلکی سی چادر پڑی ہے۔ اور وہ اگلا سا جوش اور تعمیری جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔ جہاں کہیں رجائیت بھی نظر آتی ہے، وہ دراصل اگلی تان کی صدائے بازگشت ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفےٰ کمال نے ٹرکی کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفےٰ کمال پر پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں اور طلوعِ اسلام کے عنوان سے ایک نظم شاعر نے پیش کی۔ یہاں اقبال کی تان میں پھر وہی اگلی سی تڑپ صاف طور پر نمایاں ہے۔ لیکن یہ خوشی دیر تک رہنے والی نہ تھی، اس لئے مصطفےٰ کمال نے بعد میں جو کچھ کیا اُس سے نہ صرف اقبال، بلکہ تمام سادہ دل مسلمانوں کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نظم کے کچھ اشعار یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ کن توقعات سے اقبال نے مصطفےٰ کمال کا خیر مقدم کیا تھا:۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق پر آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
(ترکون) کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن اس اُمید کے زائل ہونے کے بعد سے اقبال نے پھر اس سراب رنگ و بو کی طرف رُخ نہیں کیا اور نہ صرف اس میدان سے مُنہہ موڑا، بلکہ ایک عرصے تک "گیسوئے اُردو" کی شانہ گری بھی چھوڑ دی اور مولانا رومؒ کی دنیائے عشق میں پناہ لی، یا اپنی اُس سدا بہار دُنیا میں جس کے لازوال نقوش ملٹن کی "گم شدہ فردوس" یا دانتے کے "آسمانی طربیہ" سے آنکھیں ملاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصے تک اقبال پر اپنی اُمیدوں کے خاک و خوں ہو جانے کا اثر ضرور رہا ہوگا۔ مخالفوں کی جلی کٹی باتیں زخم پر نمک کا کام کرتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ میخانۂ "لَا تَقْنَطُوا" کا

اقبال کا شاعرانہ فلسفہ

یہ پُرانا دُردی کش تا دیر اثر نہ لے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اُسکی "ہمہ اسلامیت" ہمہ مجذوبیت کی مترادف قرار دیجائے اور اُس کا دل نہ دُکھے؟ جب اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے بے اختیار وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے جبکہ انگلستان کا برگزیدہ نابینا شاعر (جان ملٹن) اپنی پوتر تحریک کی شکست کے بعد اپنے امرت بھرے قلم سے وہ لازوال نقوش تیار کر رہا تھا جن میں جا بجا عبرانی رسولوں کے غضب کی شان دمکتی ہے۔ اقبال کے اس دَور کے کلام میں بھی بعض مقامات پر وہی آتش شانِ غضب ہے۔ جاوید نامے کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اُس حصّے سے ماخوذ ہیں جہاں شاعر "فلک زہرہ" پر خدایانِ کُہن کو شاداں دیکھتا ہے بعل بغلیں بجا رہا ہے کہ حق اور دینِ برحق کی کیسی خواری ہوی اور کس طرح دُنیا از سرِ نو بُت پرستی اور حیلہ جوئی کی طرف عود کر رہی ہے۔ اس طنز آمیز تشبیہ اور کنائے کی آڑ میں اقبال دراصل اپنے مخالفین پر برہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اشعار ہیں:۔

آدم ایں نیلی تتق را بر درید — آں سُوئے گردوں خدائے را ندید

جانش از محمود می گردد قرار — بُو کہ عہدِ رفتہ باز آید پدید

زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس — آنکہ مارا از لحد بیروں کشید

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

درنگر، آں حلقۂ وحدت شکست! آلِ ابراہیمؑ بے ذوقِ الست!

صحبتش پاشیدہ، جامش ریز ریز آنکہ بود از بادہ جبریلؑ مست!

خونِ او سرد، از شکوہِ دیریاں لاجرم، پیرِ حرم زنار بست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں باز آمد ایامِ طرب ویں ہزیمت خوردہ، از ملک و نسب!

از چراغِ مصطفیٰ اندیشہ چیست؟ زانکہ اُو را پف زند، صد بولہب!

اہرمن را زندہ کردہ افسونِ غرب روز یزداں زرد رُو از بیم شب!

(نغمۂ بعل۔ جاوید نامہ)

جاوید نامہ واقعی جاوید نامہ ہے۔ لیکن اس لازوال کتاب کے شاعرانہ محاسن پر نقد و تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کے سلسلے میں بشرطِ موقع اس پر تفصیلی تنقید کروں گا۔

بہرحال اقبال کا فلسفیانہ خواب کام ہوا۔ اور ناکام ہونا اُس کی قسمت میں تھا۔ البتہ اس حد تک اُنکی شاعرانہ پیش بینیاں صحیح اُتریں کہ اسلامی ممالک میں بیداری اور حیاتِ نو کی برقی لہر دوڑ کر رہی۔ لیکن جس راستے پر اقبال مسلمانوں کو چلانا چاہتے تھے، وہ نہ ہوا۔ وہ، ایران اور

ترکی کی بیداری کو خوف کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اسلئے کہ اسلامی روایات سے اِن دونوں ممالک کا کھلا اِنحراف ایک نہ ایک دن اُسی تباہی کا باعث ہوگا جس میں یورپ مبتلا ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کی بدلی ہوی روش اقبال کے نزدیک وہی اندھی تقلید ہے جس پر تجدّد کا کبھی اطلاق نہیں ہوسکتا۔ وہی مصطفٰے کمال جو طلوعِ اسلام میں اقبال کا درپردہ ہیرو تھا اور جسے پیامِ مشرق میں بھی ایک جگہ سراہا گیا ہے، جاوید نامے میں مُوردِ طعن بن جاتا ہے:۔

مُصطفٰے کو از تجدّد می سُرود — گفت نقشِ کہنہ را باید زُدود
نَو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات — گر ز افرنگ آیدش لات و منات
تُرک را آہنگِ نَو در چنگ نیست — تازہ اش جُز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ اُو را دمے دیگر نبود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود

(فلکِ قمر۔ جاوید نامہ)

لیکن "بے خودی" کی اِس شکست سے "خودی" کی نَوا دن بدن تلخ ہوتی گئی۔ زبورِ عجم، جاوید نامہ، ضربِ کلیم، اور پس چہ باید کرد...... اِسی شکست کی آواز یا خودی کی صدائے بازگشت ہیں۔ یہ کوئی ضروری بات بھی نہیں کہ ایک شاعر کا خواب حرف بہ حرف صحیح اترے۔

شاعر کا کام ہے ایک نشانِ راہ بتانا اور چند نقوش کا پیش کرنا۔ خواب کا صورت پذیر ہونا، طریقۂ عمل پر منحصر ہے، جو دوسروں کا کام ہے۔ اپنے مُعترضین کے جواب میں (جنھوں نے بعض اوقات غائبانہ اور بعض اوقات کھُلم کھُلا اعتراضوں کی بوچھار شروع کی تھی) اقبال نے ایک جگہ جو کچھ لکھا ہے، اُس کا بھی تقریباً یہی مطلب ہے۔ "میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھکو 'پان اسلامزم' (ہمہ اسلامیت) کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھکو 'پان اسلامسٹ' ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو 'مشن' اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہیگا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے مٹ کر رہیگی۔ اور اسلامی رُوح آخر کار غالب آئیگی۔ اِس 'مشن' کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعے تمام قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اُس 'اسپرٹ' کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت اور اُمارت کے وہ اِس دارِ فانی کی کوئی حقیقت سمجھتے تھے۔"

مندرجۂ بالا عبارت سے دو پہلوؤں پر اور بھی روشنی پڑتی ہے:

(۱) یہ کہ وہ "پان اسلامسٹ" تھے ضرور مگر بہ حیثیت شاعر، اِس تحریک کے

عملی پہلو سے اُنھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ (۲) یہ کہ بہ حیثیت ایک مذہبی انسان اور دین دار مسلمان کے، وہ آخر دم تک اس امر کا ایقان رکھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن اسلام کا ستارہ طلوع ہو کر رہے گا، جیسا کہ ائمہ اور اکابر ملت نے بشارتیں دی ہیں۔ چنانچہ پان اسلامزم کی بظاہر شکست کے بعد بھی وہ اپنی زبردست رجائیت اور قوتِ ایمان کی بدولت، اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے ناامید نہ تھے۔ لیکن ہمیں یہاں پر واقعات سے بحث ہے نہ کہ توقعات سے۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفیانہ خواب کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بھی، اُسکی شاعری کا طلسم برقرار ہے۔ یہ ہے شاعرانہ ساحری اور یہی حقیقی اقبال ہے۔ وہ شاعر پیدا ہوا، شاعر رہا، شاعر مرا۔ ماناکہ وہ فلسفی بھی تھا، لیکن فلسفہ اُس کے لئے ایک اکتسابی چیز تھی۔ فلسفے کی رَو میں وہ مدتوں بہتا رہا، اُسکی شاعری کی عظمت اور بنا بھی فلسفے ہی پر ہے تاہم فلسفہ علم ہے اور شاعری، عشق۔ شاعری سے اُسے عشق تھا، اور عشق اُس کی شاعری ہے۔ یہی اُس کا من بھاتا کھاجا تھی۔ اِسی سے اُس نے سُکون پایا اور اسی کے ذریعے اُس نے اوروں کو سُکون بخشا۔

ہو سکتا ہے (بلکہ یقین کے ساتھ کہا جائیگا) کہ اُسے اسلام اور

رسول عربیؐ سے عشق تھا لیکن آج کل کے بعض قومی رہنماؤں کی طرح عملی سیاسیات اور دھرم بھیڑوں میں پھنس کر، پرچاری اور اچھوت بننے کی اُس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ عمر بھر اپنے قناعت کدے میں دھونی رمائے، قلندرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس رنگ کو مرتے دم تک نبھاتا رہا ؂

سر آمد روزگار آں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ نہ آید؟

تمدنِ عتیق

(تنقیدی اقتباسات)

پیش تاریخی عہد، اور قدیم ترین زمانوں کی بھولی بسری کہانی

"تمدّنِ عتیق"

(از)

ابوظفر عبدالواحد، ایم اے۔ اور عطاء الرحمٰن بی اے۔

خلاصۂ کتاب

یہ کتاب جیسا کہ بعض صاحب نظر حضرات کی انفرادی رایوں اور حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے ممتاز جرائد و رسائل کی غیر جانبدارانہ ستائشوں سے ظاہر ہوگا، بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد سلیس اور خاطر نشیں انداز بیان میں لکھی گئی ہے۔

گو کتاب کا بیشتر مواد: پیش آریائی ہندوستان، سامرستان، مصر قدیم، آشوریہ، اور بنی اسرائیل کی مختصر و جامع تاریخ پر مشتمل ہے، لیکن پس منظر کے طور پر نہایت دل نشیں اور دل چسپ انداز میں پیش تاریخی عہد، و نیز تخلیق کائنات کے بارے میں سائنس کے نظری

مسائل پر اجمالی مگر خاصی بحث کی گئی ہے: مثلاً زمین کس طرح وجود میں آئی اور سطح زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی، کس طرح انسان نے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی، انسان کے پہلے پہل عقائد و تخیلات کیا تھے۔ کس طرح اول اول شہری ریاستیں قائم ہوئیں، پھر رفتہ رفتہ تمدن و معاشرت کا خاکہ تیار ہوا۔ کس طرح بحر و بر پر انسانی فتوحات کی ابتدا ہوئی، اور اپنے کارناموں کے تحفظ کی فطری تحریک کی بنا پر انسانوں نے فن تحریر کی ابتدا کی اور کس طرح دنیا کے قدیم ترین تمدنوں کے بانیوں نے جدید تمدن کے بانیوں کو اپنی بے نظیر صنّاعی، مُصوّری، تعمیر کاری، سنگ تراشی کے نمونوں سے متحیر کر دیا، اور کس طرح جدید تمدنوں کی شاندار ترقی اِن قدیم فن کاروں کی مرہون ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کتاب کے آخری باب سے پہلے کا باب، خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے اور بھی دلچسپی کا باعث ہوگا جو عام تاریخ کے علاوہ تاریخ مذہب سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس باب میں بنی اسرائیل کی بصیرت افروز تاریخ کے علاوہ، اُن کے رسولوں کی بعثت، اُنکی پُرجوش تعلیم، فراعنۂ مصر کی زیادتیاں اور حضرت موسیٰؑ کی سرکردگی میں اسرائیلیوں کا خروج، ارض موعود میں اُنکی سکونت پذیری، حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کی رسالت اور بادشاہی کے بعض دلچسپ حالات، اور بختِ نصر کے

ہاتھ حضرت سلیمان کی بنی بنائی سلطنت کی تباہی اور یروشلم کی تاراجی کا احوال درج ہے۔

بہرحال ہر لحاظ سے یہ کتاب اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات بھی دیئے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے والے اس کتاب کے محاسن کا اندازہ آپ کر لیں۔ کتابت و طباعت بھی صاف اور غلطیوں سے پاک ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود، قیمت نہایت واجبی ہے۔ (۱) مصوّر اور مجلد اڈیشن (تین روپیہ) - (۲) غیر مصوّر اڈیشن (جس میں دو کار آمد نقشے بدستور رکھے گئے ہیں) دو روپیہ عالی

کتاب کے متعلق رائیں

انفرادی

۱۔ انگریزی میں اس مضمون کی بہت کتابیں ہیں اور بڑی موٹی موٹی ہیں۔ لیکن اردو میں ایسی کوئی تحریر، کتاب کی صورت میں میری نظر سے نہیں گزری۔ ... اس کتاب میں بعض الفاظ ایسے آ گئے ہیں کہ جن کا سمجھنا ہر شخص کے لئے دشوار ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ مضمون کے لحاظ سے ان الفاظ کا آنا ضروری تھا۔ ... (مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب (ایک خط میں) مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۵ء)

۲- میں نے تمدنِ عتیق کا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ جس محنت اور خوش اسلوبی سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے، اُس کے لئے آپ اور آپ کے شریک کار دونوں مستحق تہنیت ہیں۔ اب تک اس موضوع پر اُردو زبان میں کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ اس لئے یہ کہنا بمالغہ نہیں کہ آپنے یہ کتاب لکھ کر اردو کے کتابی ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔ کسی نئے موضوع پر قلم اُٹھانے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں، اُنکو آپ نے اس خوبی سے طے کیا ہے کہ مطلب کی جدّت سے زبان میں اجنبیت پیدا نہیں ہونے پائی....

(سید مسعود حسن صاحب رضوی۔ صدر شعبۂ اُردو و فارسی۔ لکھنو یونیورسٹی مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

۳- "مجھے حال ہی میں "تمدنِ عتیق" کے سرسری مطالعے کا موقع ملا۔ میں تو اِس کو اُردو کی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں کہ اُس پر آپ جیسے فنّی حضرات نے اپنے نتائج افکار قلمبند کرنے شروع کر دئیے ہیں۔ اس کتاب کو دیکھنے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ آپ نے "تمدن" کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا ہے، کیونکہ مبتدیوں کے لئے اس طرح سلاست اور روانی سے گفتگو کرنا کافی مطالعے کے بغیر ناممکن ہے...." (مولوی عبد الحمید صاحب، مدیر "ہمدرد صحت"۔ دہلی ۲۹ر مارچ ۱۹۳۷ء)

۴- "میں نے آپ کی تالیف "تمدن عتیق" بڑے ذوق و شوق سے

دیکھی۔ انگریزی داں اصحاب کی یہ کوشش کہ علوم جدید کو اپنی زبان کا جامہ پہنائیں، ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی۔ آپ صاحبان نے اس بارے میں پیش قدمی فرماکر اُردو زبان پر احسان کیا ہے...."

(مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے، کینٹب صدر کلیۂ تعلیم جامعہ عثمانیہ ۲۷ رمہر سنہ ۴۵ ف)

۵۔ "میں نے ابوظفر عبدالواحد صاحب اور عطار الرحمٰن صاحب کی تصنیف "تمدن عتیق" بغور دیکھی جو اپنے مضمون پر ایک نئی کتاب ہے...." (حمید احمد صاحب انصاری، رجسٹرار جامعہ عثمانیہ ۲۴ رمہر سنہ ۴۵ ف)

اخبارات

۱۔ "اُردو زبان میں عہد عتیق کے متعلق ایسی مختصر مگر جامع کوئی دوسری کتاب غالباً ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اور یہ پہلی کوشش ایک کامیاب کوشش ہے اور اُردو زبان میں اس کتاب کا اضافہ ایک مفید اضافہ ہے.... جب کوئی مؤلف، تاریخی معلومات کے انبار کو سامنے رکھ کر ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کرنا چاہتا ہے تو اُس کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اُس انبار میں سے اختصار کو مدنظر رکھ کر صحیح انتخاب کرنا اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ صاحب قلم کی نظر اپنے موضوع کی تمام

وسعت پر حاوی ہو۔ قابل مؤلفین نے یقیناً اس کام میں دردسری برداشت کی ہوگی۔ اُنکا انتخاب اور کتاب کی ترتیب بہت شائستہ ہے۔ اسی طرح انداز بیان بھی سُلجھا ہوا ہے۔ ....." (قاضی عبد الغفار صاحب، مدیر پیام آگسٹ ۱۹۳۶ء)

۲۔ "زیر نظر کتاب میں قدیم تہذیب و تمدن کا تاریخی حال قلمبند کیا گیا ہے اور اُسکی بنیاد مذہبی پیشواؤں کے بیانات پر نہیں (جن کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے) بلکہ سائنس کے منطقی و تحقیقاتی دلائل پر رکھی گئی ہے۔ پیرایۂ بیان بہت دلچسپ و دل نشین ہے ....." (روزنامۂ مشیر ۵ ار آگسٹ ۱۹۳۶ء)

۳۔ "فاضل مؤلفین نے اس میں بڑی کامیابی کے ساتھ انسانی ارتقار کا موجودہ سائنٹفک نظریہ پیش کیا ہے، اور اس کے بعد کسی قدر تفصیل اور ربط کے ساتھ انسانی تمدن کی ترقی کی داستان بیان کی ہے اور ہر دور میں اُن تمام عظیم الشان سلطنتوں کا ذکر ہو گیا ہے جنھوں نے اس ارتقا میں مدد کی ہے ..... انداز بیان بہت سُلجھا ہوا ہے اور موضوع بحث کے اعتبار سے یہ اُردو زبان میں ایک نئی چیز ہے اور قابل قدر..." (روزنامۂ رہبر۔ مہر ۱۳۴۵ ف)

رسائل

۱- یہ تصنیف نتیجہ ہے جناب ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے اور محمد عطاء الرحمٰن صاحب بی۔ اے۔ کی متحدہ کوششوں کا۔ اس کتاب میں ابتدائے آفرینش سے لے کر عبرانیوں تک کے زمانے کا حال لکھا گیا ہے، اور نہایت صاف و شستہ زبان میں سامرستان، مصر، اور آشوریہ کے تمدن سے بھی اسی سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔ جا بجا نقوش و تصاویر سے اسے اور زیادہ دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔" (رسالۂ نگار دسمبر ۱۹۳۶ء)

۲- اس تالیف میں آغاز گیتی سے لے کر ظہور مسیحؑ سے کچھ عرصے پہلے تک کا جستہ جستہ حال لکھا گیا ہے۔ کتاب، درسی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور طلبا کے ذہنی نمو کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بیان آسان اور سلجھا ہوا ہے.... تصویروں اور نقشوں نے کتاب کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنا دیا ہے...." (رسالۂ اردو، اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

۳- ہماری زبان میں عہد عتیق کی تاریخ پر بہت کم کتابیں ہیں۔ "تمدن عتیق" میں لائق مؤلفین نے آغاز آفرینش سے لے کر بخت نصر تک کے مختصر حالات جمع کر دیئے ہیں۔ ابتدائی ابواب میں تخلیق عالم کی سرگزشت ہے کہ کس طرح زمین بنی، اور پھر بتدریج اس پر کیسے زندگی

اور پھر انسانی زندگی کا ظہور ہوا۔ پھر تمدن کے ابتدائی دوروں میں ہندوستان، سامرستان، اور مصر کے حالات اور یہاں کے باشندوں کے مذہبی اور ادبی رجحانات، اُن کے علوم، وغیرہ وغیرہ کی سرگزشت ہے۔ گو یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت مختصر ہے، تاہم اُس کے پڑھنے سے اجمالی حالات ذہن میں آجاتے ہیں۔۔۔۔ کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے۔ (رسالۂ معارف۔ اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

۴۔ "فاضل مؤلفین نے سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کرۂ ارض کے معرض وجود میں آنے اور اس پر زندگی کے اولین نمو سے لے کر، حضرت انسان کے وُرود اور اُس کے معاشری اور تمدنی ارتقاء پر بحث کی ہے۔ اگرچہ جو نتائج مستنبط کئے گئے ہیں، اُنھیں قطعی اور آخری نہیں کہا جاسکتا، لیکن فرسودہ توہمات اور قیاسات کے مقابلے میں انکی دلائیل واقعات اور شواہد کی اُستوار بنیادوں پر قائم ہیں۔ انداز بیان شُستہ اور عام فہم ہے۔" (ادبی دنیا۔ اپریل ۱۹۳۷ء)

ملنے کے پتے

(۱) مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی اور لاہور (۲) "کتابستان"۔ الہ آباد
(۳) مکتبۂ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن (۴) مکتبۂ ادبیاتِ سٹی کالج۔ حیدرآباد دکن

آسکر وائیلڈ کا شاہکار

(پکچر آف ڈورین گرے)

آسکر وائیلڈ کی کچھ کتابیں اردو میں منتقل کی گئی ہیں، لیکن سب میں ترجمے کی بُو آتی ہے۔ ابوظفر عبدالواحد صاحب نے اصل کا زور برقرار رکھتے ہوئے غالباً پہلی بار وائیلڈ کے ایک شاہکار ناول کو ڈرامائی قالب میں کامیابی کے ساتھ ڈھالا ہے۔ ڈرامہ چار ایکٹ میں ہے اور ماحول، کردار، اور مکالمہ سب کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ مطلق اجنبیت اور بدیسی پن کا گمان نہیں گزرتا۔ یہہ کتاب کوئی دو سال سے لکھی رکھی ہے۔ اور خاص اہتمام کے ساتھ عنقریب شایع ہونے والی ہے۔ جو شایقین قبل از قبل اپنے نام رجسٹر کرائیں انھیں معافی محصول کے ساتھ یہہ کتاب روانہ کی جائیگی۔

المشتہر

مینجر۔ مکتبۂ اِمداد باہمی۔ سٹی کالج۔ حیدرآباد دکن